ایراوتی کے آنسو
اے حمید

ایراوتی کے آنسو

(آپ بیتی)

اے حمید

پراسرار دیوی

اب اس گھر میں میرا ذرا جی نہ لگتا تھا۔ میں اداس اداس رہنے لگا اور جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرنے لگا کہ وہاں سے نکال دیا جاؤں۔ اس دوران ساتھ والے پارسی لونڈے سے میری بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کی مدد سے مجھے بلیڈ پیئر کے علاقے میں موٹروں کی ایک ورکشاپ میں ملازمت مل گئی۔ یہاں بھی بھانت بھانت کے کام کرنے پڑتے۔ کسی وقت ہیڈ مستری کھلے ہوئے انجن پر جھک کر پیچیدہ پرزوں کا گوڑ جوڑ سمجھانے لگتا تو ڈھارس بندھ جاتی کہ اور کچھ نہیں تو کوئی ہنر ہی آ جائے گا۔ یہاں ہر کوئی اپنا راگ الاپتا تھا۔ گورا چٹا سترنگ خوبصورت پارسی مینجر مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا۔ ''یہ سارے کاریگر بڑے چھٹے ہوئے ہیں' تم ان سے بچ کر رہنا۔ میں ان سالوں کی ایک ایک رگ سے واقف ہوں۔''

ناٹے قد کا ہیڈ مستری نصف دھڑ انجن کے نیچے لے جا کر فٹ بریک کا پیچ کھولتے ہوئے مجھے سمجھانے لگا۔

''تم پنجابی ہو اور میں بھی پنجابی ہوں' میری ایک بات پلے سے باندھ لو کہ اگر مر بھی رہے ہو تو ان پارسیوں کے ہاتھ کا پانی مت پینا۔''

میں نے کالی کترن سے بلہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ کیوں دادا؟''

ہیڈ مستری نے سر باہر نکال کر بیڑی سلگائی اور زور سے تھوک کر بولا۔

''اس لیے کہ یہ مردے کو دفن نہیں کرتے' چیل کوؤں کو ڈال دیتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی مذہب ہے۔''

ورکشاپ کا مالک لاہور کا رہنے والا تھا اور ایک مدت سے بمبئی میں مقیم تھا۔ اس کے بال ہریالے' عمر چالیس سے اوپر لیکن ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ اس کا ایک قریبی رشتہ دار پرکاش فلم کمپنی کی سٹنٹ فلموں میں ولن کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا اور دوسرے تیسرے دن اپنی بھینسے ایسی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اندھیری پرکاش سٹوڈیو جاتے ہوئے وہاں سے گزرا کرتا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے وہ گیراج میں ضرور ٹھہرتا تھا۔ اس کا قد اونچا' ناک لمبی اور بال ایکٹروں ایسے گنجان تھے۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں امرتسر کا ہوں اور گھر سے بھاگ کر بمبئی آیا ہوں تو اسے جانے مجھ سے کیوں دلچسپی ہو گئی۔ چنانچہ وہ کبھی کبھی اپنے ساتھ سٹوڈیو کی سیر کو لے جاتا۔

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ پرکاش منروا سٹوڈیو میں فلموں کی شوٹنگ ہوتی دیکھی۔ پہلی بار میلا' درگا کھوٹے' نرملا اور ثریا کو دیکھا لیکن جسے دیکھنے میں نکلا تھا۔ وہ چہرا کہیں دکھائی نہ دیا وہ مورت کہیں نظر نہ آئی۔ ہمارے مالک کا ایکٹر رشتہ دار انڈیا گیٹ کی جانب

ایروس سینما کے سامنے ایک دلکش عمارت کی پہلی منزل میں رہتا تھا۔ کئی بار وہ مجھے اس عالیشان عمارت میں اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں ایک کمرہ کے وسط میں قالین پر گول میز اور میز پر شیشے کے برتن میں پھل پڑے رہتے تھے' جنہیں کبھی کوئی نہ کھاتا تھا۔ میں گھر کی مالکن کے پاس باورچی خانے میں جا کر بیٹھ جاتا اور مجھ سے بڑی محبت سے پیش آیا کرتی۔ اسی گھر میں ایک نوجوان اور موٹی موٹی آنکھوں والی ایک خوبصورت لڑکی بھی رہا کرتی تھی' جسے میں رنگین ساڑھی میں ملبوس کبھی کار سے نکل کر گھر میں داخل ہوتے دیکھتا اور کبھی گھر سے نکل کر کچھ لوگوں کے ساتھ کار میں سوار ہوتے دیکھا کرتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اسی لڑکی کی کئی ایک مختلف تصویریں بھی آویزاں تھیں۔ ان دنوں یہ لڑکی ہندوستان کی چوٹی کی ہیروئنوں میں سے ایک ہے اور مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی ماں کے پاس باورچی خانے میں بیٹھا کرتا تھا۔

میں سارا دن ورکشاپ میں کام کرتا اور کام سیکھتا۔ رات کو اس عمارت کے تیسرے فلیٹ پر بالکونی میں فوجی کھاٹ بچھا کر سو رہتا انہی دنوں ایک صاحب لاہور سے ہمارے گیراج میں تشریف لائے' ایک بغیر پہیوں کی پرانی کار میں اپنا بستر جما دیا۔ آپ کا سر گنجا ہوا' کھوپڑی گنجی' ناک چڑیا سی نوکیلی تھی اور داہنے ہاتھ کی درمیان کی تین انگلیاں غائب تھیں۔ آپ نے آتے ہی ہمارے مالک سے ملاقات کی اور تولیہ کندھے پر ڈال کر مجھ سے پوچھا۔

''کیوں بھئی' غسل خانہ کہاں ہے؟''

بعد میں پتہ چلا کہ آپ مس خورشید پر عاشق ہیں اور اسی کے عشق میں بمبئی آئے ہیں۔ آپ کی عمر چالیس کے قریب تھی اور بات کرتے ہوئے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرا کرتے تھے۔ جب میں نے پوچھا' کیا وہ بھاگ کر بمبئی آئے ہیں ۔۔۔۔۔۔ تو آپ قہقہہ مار کر ہنسے۔

''ارے یار! میں کیوں بھاگنے لگا ۔۔۔۔۔۔ میں کوئی یتیم ہوں۔''

دوپہر کو کھانے کے بعد وہ میرے سامنے مس خورشید کا قصیدہ لے کر بیٹھ جاتے۔ بس جی' لاکھ باتوں کی ایک بات کہ اس کی آنکھوں میں وہ جادو ہے کہ جس کا کوئی منتر نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے صرف ایک بار اس کی گود میں سر رکھ کر فلم ''چاندنی'' والی لوری سن لوں۔ ارے تمہیں وہ لوری یاد ہے لونڈے؟''

میرے انکار پر اس کی بادام ایسی آنکھیں سمٹ گئیں۔

''سن لو تو فوراً نیند آ جائے۔''

آپ ہفتہ بھر مس خورشید کے گھر اور ریجنٹ سٹوڈیو کے چکر کاٹتے رہے لیکن باریابی حاصل نہ ہو سکی۔ تھک ہار کر گیراج کے باہر سٹول پر آ کر بیٹھ گئے اور چائے کے کپ کا آرڈر دے کر مجھ سے فرمایا۔

''ایک دن میرے پاس بہت سارا روپیہ آ جائے گا اور پھر میں اخباروں میں مس خورشید کی خوب پبلسٹی کراؤں گا۔ جب پبلسٹی ہو جائے گی تو تاج ہوٹل میں ایک شاندار دعوت رچاؤں گا۔ اس کے بعد اسے کار میں بٹھا کر چوپاٹی کی سیر کراؤں گا اور بس ۔۔۔۔۔۔ برخوردار ان ایکٹرسوں کو پھانسنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔''

بار بار زبان پھیرنے کے باوجود ان کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ ایک دن جانے کدھر غائب ہو گئے۔ میں صبح گیراج میں آیا تو پرانی کار میں ان کا بستر اور ان کا صندوق غائب تھا اس کے بعد ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

تیسری منزل کی ایک کوٹھڑی میں بوڑھا کھوسٹ رہتا تھا جس کے پاس آغا حشر کے ڈراموں کے چند مسودے پڑے تھے۔ اس نے اشتہار دے رکھا تھا جس کو ضرورت ہو اس سے آن کر قیمتاً لے جائے۔ جب کوئی گاہک آتا تو بوڑھا اسے اس قدر مہنگے دام بتاتا کہ وہ چکرا جاتا۔ اس پر بوڑھا تن کر کھڑا ہو جاتا اور تھیٹریکل انداز میں پکار اٹھتا۔

''نکل جاؤ میرے محل سے' ابھی نکل جاؤ ۔۔۔۔۔۔ ورنہ غلاموں کو بلا کر ابھی تکہ بوٹی کرا دوں گا۔'' پھر وہ زور سے تالی بجاتا۔

''کوئی ہے؟''

لیکن اس سے پیشتر کہ کوئی آئے' گاہک بازار میں کھڑا ٹرام کا انتظار کر رہا ہوتا۔ اسی طرح ایک طرحدار لڑکے پر ایکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔ اس کی کوٹھڑی سے رات بھر پرانی فلموں کے ڈائیلاگ بولنے کی آوازیں آیا کرتیں۔ دن کو بالوں میں چھلے ڈال' پتلون کی استری جما اپنی ڈیڑھ درجن مختلف پوز کی تصاویر تھیلے میں ڈال سٹوڈیو کے چکر کاٹنے باہر نکل جاتا۔ شام کو تھکا ہارا واپس آ کر اپنی کوٹھی میں پڑا رہتا اور رات کے کسی لمحے دیوانوں کی طرح کسی فرضی ہیروئن یا اس کے باپ سے غضب ناک آواز میں ہم کلام ہو جاتا۔

''یہ شادی آپ کو کرنی ہی پڑے گی۔''

''میں ظالم سماج کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔''

''قتل کر دوں گا ۔۔۔۔۔۔ خون کی ندیاں بہا دوں گا۔''

اسی طرح ایک رات ڈائیلاگ بولتے بولتے اسے خون کی قے ہو گئی اور اگلے روز کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

جس روز بارش ہوتی' میں کھاٹ اٹھا کر کوٹھری میں آ جاتا۔ میرا ساتھی مستری فرش پر دری بچھا کر بیٹھ جاتا اور گرم چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے مجھے اپنے شہر کی باتیں سنایا کرتا۔

سیالکوٹ سارے پنجاب میں اول نمبر شہر ہے۔ وہاں پورن کا تاریخی کنواں ہے۔ پورن جی بڑے پہنچے ہوئے درویش تھے۔ ہندوؤں میں بھی ولی اللہ ہوئے ہیں۔ بس یہی کمی رہی ہے کہ انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا۔

مستری راگ رنگ کا بڑا شوقین تھا۔ چائے ختم کر کے وہ کیتلی لے کر بیٹھ جاتا اور اس پر ہاتھ سے طبلہ بجاتے ہوئے کوئی نہ کوئی راگ چھیڑ دیتا۔ وہ گانے میں اس قدر مگن ہوتا کہ اس کی آنکھیں بند ہوتیں اور سر کسی غیبی طاقت کے زیر اثر جھوم رہا ہوتا باہر بارش ۔۔۔۔۔۔ بمبئی کی موسلا دھار بارش کے شور میں گڑگڑاتی ٹرام کاروں اور موٹروں کا شور دب گیا تھا۔ اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے سوچ رہا ہوتا کہ امرتسر سے اس ڈربے میں کیسے آ گیا۔۔۔۔۔۔ اور اب تک یونہی پڑا رہوں گا۔ گھر واپس جانے کو بہت جی چاہتا تھا۔ لیکن جب اپنے باپ کی مار پیٹ اور استادوں کی ٹھکائی کا خیال آتا تو جی کہتا یہیں پڑے رہیے اور کبھی اس نگری کا رخ نہ کیجئے۔ اب مجھے بمبئی شہر میں کافی واقفیت ہو گئی تھی اور میں اکثر تن تنہا پیدل سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا تھا۔ اتوار کو میں چوپاٹی اور بال کشور کی سیر کرتا اور روزانہ شام کو انڈیا گیٹ پر گھوما کرتا۔ میں نمکین مونگ پھلی یا مسالے دار چاٹ کی پڑیا لے کر سمندر کنارے والی پتھریلی دیوار پر بیٹھ جاتا اور نیلے سمندر میں تیرنے والی سفید بادبانی کشتیوں' کھلی سڑکوں پر گزرتی دومنزلہ بسوں' چمکیلی کاروں اور سمندر کنارے جھکے ہوئے پام کے لہراتے درختوں کا نظارہ کیا کرتا۔

اب میں ورکشاپ میں اکثر غیر حاضر رہنے لگا۔ ہیڈ مستری نے کئی بار میرے کان کھینچے اور باٹا نے فقرہ چست کیا۔

''کہاں گزاری رتیاں بانکے چھیلا رے؟''

مالک نے مجھ پر کیا بگڑنا تھا' وہ گیراج میں عموماً رات کو آیا کرتا تھا۔ لیکن دوسرے مستریوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ورکشاپ میں کھویا کھویا سا رہنے لگا اور اکثر سوچا کرتا کہ کوئی ایسا جتن کیا جائے کہ بوریا بستر باندھ کر مندر میں ڈیرا جمایا جائے۔ دیوی جی مجھ پر پرانی مہربان تھیں اور میرا خیال رکھا کرتی تھیں۔ ان کی شفقت اور محبت آج بھی یاد آتی ہے تو دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ شاید یہ انہی کی سنگت اور فیضان نظر تھا کہ میں اس قدر گھناؤنے ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنے دل کے کنول کی طرح اوپر اٹھائے رکھا اور اس پر گندے تالاب کا ایک چھینٹا بھی نہ پڑنے دیا۔ ان کے چہرے کی افسردہ شگفتگی میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔

میں نے ان سے کوئی بات نہ چھپائی تھی میں نے ان کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور امرتسر سے بھاگ کر بمبئی آیا ہوں۔ اس پر انہوں نے معمولی تعجب کا اظہار کیا تھا اور مجھے نصیحت کی تھی کہ میں اپنی والدہ کو خط لکھوں۔ چنانچہ انہی کے اشارے پر میں نے پردیس میں آ کر پہلی بار اپنی والدہ کو خط لکھا۔

مندر کے مہنت سے مجھے سخت نفرت تھی۔ اس کی لال لال شنگرف ایسی آنکھیں اور پھولی ہوئی توند دیکھ کر میں اندر ہی اندر جل بھن جایا کرتا۔ وہ مجھ سے جلتا تھا اور اکثر میرے وہاں چلنے پھرنے پر روک ٹوک کیا کرتا تھا۔ میں نے جب اس بات کا ذکر دیوی جی سے کیا تو انہوں نے حسب عادت افسردہ تبسم کے ساتھ کہا۔

''تم ان باتوں پر دھیان نہ دیا کرو' وہ مجھ سے بھی خفا ہے' وہ مجھے بھی تنگ کرتا ہے اور جانتے ہو' وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔'' میں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا لیا۔ دیوی جی نے جھک کر کہا۔ ''اس لیے کہ اس کی آنکھوں میں واسنا ہے' طمع ہے۔''

میں دیوی جی کی سرگوشی کا مطلب سمجھ نہ پایا اور چپکے سے واپس ورکشاپ میں چلا آیا۔ یہاں آیا تو ہمارا مالک جو پرانا شکاری بھی تھا۔ اس نے عین موقعے پر مجھے گاڑی میں بٹھا لیا اور قبل اس کے کہ میں کچھ سوچ سکوں' ہماری ٹیٹنشن ویگن ہمارے مالک مسٹر جہانگیر ایک انگریز اور کچھ دوسرے آدمیوں' بندوقوں' رائفلوں' چاقوؤں اور سامان خورد و نوش سے بھرے ہوئے تھیلوں کو لادے بمبئی شہر سے باہر دریا کے ساتھ ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔

شام کو ہم شہر سے ساٹھ ستر میل دور گھنے جنگلوں میں ایک سرحدی گاؤں میں داخل ہوئے۔ یہاں بانس کے بنے ہوئے چائے خانے میں بیٹھ کر شام کا کھانا کھایا۔ چائے کا دور چل رہا تھا کہ ایک دھوبی نے آن کر خبر دی کہ وہاں سے پانچ میل کے فاصلہ پر پکی سڑک سے اتر کر دو کوس اندر کی جانب ایک گاؤں میں شیر حملہ آور ہوتا ہے۔ ہمارے مالک نے بندوق ہوا میں اچھال کر نعرہ لگایا اور ہم لوگ اندھیرے جنگل میں رات کو پیدل چلنے لگے۔ مجھے تو ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ ساری رات ہم وہاں شیر کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ لیکن شیر ادھر نہ آیا۔ خدا نے میری دعا منظور کی اور دن نکل آیا مگر شیر کی نہ تو آواز آئی اور نہ وہ خود تشریف لائے۔ پو پھٹ رہی تھی کہ کرنڈا جھاڑیوں میں دو آنکھیں چمکیں۔ ڈن۔۔۔۔۔۔ تین بندوقیں ایک دم دم دندنا اٹھیں اور چاؤں کی آواز کے ساتھ فرضی شیر اور اصل کتا گھاس پر گر پڑا۔ باقی سارا دن پہاڑ کی ڈھلان پر شکار کی تلاش میں گزر گیا۔ اس دوران میں دو چیتل' ایک سانبھر' ایک سور اور کوئی ڈیڑھ درجن کے قریب مرغابیاں ماریں۔ شکار کا پروگرام صرف تین دن کا تھا۔ لیکن جنگلوں کی خاک چھانتے ہوئے پورے سات روز گزر گئے۔ اسی شام ہم واپس بمبئی پہنچ گئے۔ میں آتے ہی سو گیا اور دوسرے دن شام تک سویا رہا۔

شام کو اٹھا' نہا دھو کر دھوتی اور کرتہ پہنا اور ٹرام میں بیٹھ کر سیدھا بنگالی مندر کو ہو لیا۔ میں دیوی کے درشنوں کے لیے بیتاب تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے اپنے شکار کی پوری کہانی سناؤں گا۔ رومال میں لپٹی ہوئی سیاہ گلاب کی پتیاں میں سب سے آخر میں انہیں بھینٹ کرنا چاہتا تھا۔ یہ پھول میں نے ایک جگہ جنگل میں نمکین چشمے کے کنارے توڑے تھے اور سنبھال کر دیوی کے لیے رکھ لیے تھے۔

بمبئی میں سیاہ گلاب کہیں نہیں ملتا۔ میں نے سوچا' کہوں گا کہ سیاہ گلاب کے پھول میں نے رسے کے ذریعے ایک خطرناک کھڈ میں اتر کر توڑے تھے اور بڑی مشکل سے انہیں اوپر لا سکا تھا۔ خدا کرے وہ منحوس صورت مہنت وہاں نہ ہو۔

مندر کے دروازے کھلے تھے۔ میں گھنٹی بجا کر اندر داخل ہو گیا اور پچھلی طرف نکل آیا۔ شریفے کے پیڑ تلے مٹی کا چبوترا خالی تھا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر (عورت) سادھنی کانسی کے تھال میں بیسن گوندھ رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''دیوی جی کہاں ہے ماتا؟''

ماتا نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''چلی گئی ہیں۔''

''کہاں؟''

''رام جانے''

میں فوراً باہر نکل آیا۔ شام گہری ہو چلی تھی اور املی کے درختوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ میں شریفے کے پیڑ تلے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا سر بازوؤں میں چھپا دیا اور میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ مندر میں روشنی ہو رہی تھی۔ گھنٹیاں اور سنکھ بج رہے تھے۔ لڑکیوں کی ایک ٹولی بڑی اداس آواز میں بھجن کا یہ شعر بار بار دہرا رہی تھی۔

ماتا پتا سب کٹم قبیلہ

ٹوٹ گیا جوں تاگا رے

ٹوٹ گیا جوں تاگا رے

''اب روؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ خوب روؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ میری غمگین آنکھو! ان محبتوں کو روؤ' جو فنا ہو جاتی ہیں۔ ان آنسوؤں کو روؤ جو خشک ہو جاتے ہیں۔ ان رشتوں کو روؤ جو ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچے تاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ چھوٹی عمر' چھوٹا ذہن' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اتنے گہرے ناتے کچے تاگوں کی مانند کیسے ٹوٹ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟''

◆◆◆

سنہالی دیوداسیاں

آج میں یادوں کے جس گلاب کا ذکر کرنے لگا ہوں' اسے اپنی ٹہنی پر کھلے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابھی اس کی پنکھڑیوں پر شبنم کے موتی صبح کی سنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں اور اس کی خوشبو کی لہریں میرے ہونٹوں کو چوم کر گزر رہی ہیں۔ یہ گلاب' منہ بند کلی کی شکل میں بائیس برس سے ماضی کی گنجان جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اور نہ اس وقت کھلا۔ جب ہمارے جہاز نے کولمبو کے ایئر پورٹ کو چھوا۔

۲۲ مارچ کو دوپہر کی فلائیٹ پر ہم ڈھاکہ سے کراچی کی سمت روانہ ہو رہے تھے۔ میں فیضی اور زلفی کراچی سے ڈھاکہ آتے ہوئے جہاز سیلون کے جزیرے کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے سیلون کی روشنیاں دیکھنے کی کوشش کی لیکن شیشے میں مجھے اپنے چہرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ کراچی ایئر پورٹ سے رات ایک بج کر دس منٹ پر چلے تھے۔ بوئنگ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا آسمان کی وسعتوں کو چیرتا اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا اور کراچی کی رنگ برنگ روشنیاں سمٹ رہی تھیں۔ یہ روشنیاں بہت نیچے' بہت پیچھے رہ گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد ہمارا بوئنگ بحیرۂ عرب کے گہرے نیلے پانیوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

زلفی نے سیفٹی بیلٹ کھولتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور بولا۔

''میرا خیال ہے کافی منگوائی جائے۔''

کھانا ہم نے ایئر پورٹ پر ہی کھا لیا تھا۔ خوش شکل' خوش مزاج ایئر ہوسٹس مشین کی طرح مسافروں کی گودوں میں سفید سرہانے اچھالتی ہمارے قریب سے گزری تو زلفی نے کافی طلب کی۔ ایئر ہوسٹس ذرا ٹھٹھکی ' ذرا مسکرائی اور بولی۔

''کوشش کرتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ انتظار کریں۔''

جہاز سارے کا سارا مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کبھی سیٹ پیچھے کرتے' کبھی آگے کرتے' کبھی بٹن دبا کر بتی بجھاتے کبھی تازہ ہوا کے آلے کو چاروں طرف گھماتے ایئر ہوسٹس ان سے بڑی پریشان ہو رہی تھی۔

فیضی نے اپنی ہسپانوی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر گولڈ لیف کا سگریٹ سلگا لیا۔ سرخ بالوں والا گورا چٹا فیضی ہسپانیہ کا کامیڈیڈر لگتا

تھا۔ وہ بڑی پر جوش گفتگو کرتا ہے اور بولتے ہوئے موقع محل کے مطابق جسم کے ہر حصے کو ہلاتا ہے۔ کبھی مکا ہوا میں لہراتا کبھی بائیں ہاتھ کی بند مٹھی داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو زور زور سے کوٹتا ہے اور کبھی کندھے اچکا کر دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا لہرا کر کہتا ہے۔

''اوئے توں کیہ ایں۔۔۔۔۔۔۔اوئے کیہ ایں؟''

اس سے مل کر یہی خیال آتا ہے کہ وہ ایک سرفروش ہسپانوی میٹیڈور ہے جو یا تو بھینسے کو گرا رہا ہے یا اسے گرانے اکھاڑے میں جا رہا ہے۔ ویسے وہ بڑا خوش مزاج ہے' کلچرڈ ہے اور خواتین کے ساتھ بڑے دھیمے پن سے بات کرتا ہے۔ ڈھاکہ میں' میں نے اسے بوڑھی امریکی اور کینیڈین خواتین کے ہاتھ قالین بیچتے دیکھا ہے اور میں اس کی خوش اخلاقی اور نرم گفتاری کا قائل ہو گیا ہوں۔

ائیر ہوسٹس فیضی کے قریب سے گزری تو اس نے اپنی پسند کے سگریٹ کا آرڈر دیا اور بولا۔

''سیڈر کیم ہے؟''

معلوم ہوا وہ کوئی خاص قسم کا فرانسیسی مشروب چاہتا ہے' وہ وہاں نہیں تھا۔ ائیر ہوسٹس نے خندہ پیشانی سے معذرت چاہی۔

''کوئی بات نہیں' تھینک یو۔''

اس کے بعد وہ سو گیا' زلفی بھی نیوز ویک پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگا۔ میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں مگر میں جاگ رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد شیشے میں سے باہر جھانک لیتا۔ میرا خیال تھا سیلون کے اوپر سے گزرتے ہوئے کولمبو کی روشنیاں دیکھوں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ رات کسی لمحے ہمارا جہاز پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر سیلون کے اوپر سے گزر گیا اس کے بعد میں بھی سو گیا۔

آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ ہم خلیج بنگال کے سیاہ پانیوں کے اوپر پرواز کرتے ہوئے ڈھاکہ کی طرف جا رہے تھے۔ سفید بادلوں کے گالے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اتنی بلندی پر سے سمندر سلیٹی رنگ کے صحرا کی مانند دکھائی دے رہا تھا' بے جان اور بے بو۔ دھوپ بڑی روشن تھی اور آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں شٹر گرا دیا۔ خدا خدا کر کے سمندر ختم ہوا اور مشرقی پاکستان کی ہری بھری سرزمین دکھائی دی۔ دریا سفید لکیروں کی طرح دھوپ میں چمک رہے تھے۔ جہاز پر اعلان ہوا۔

''خواتین و حضرات! ہم تھوڑی ہی دیر میں ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ برائے مہربانی اپنی اپنی حفاظتی پٹیاں باندھ لیجئے۔''

ہم نے نیچے جھانک کر دیکھا' جہاز نے داہنی جانب جھک کر چکر لگایا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ ڈھاکہ کے ائیر پورٹ کے رن وے پر دوڑ رہا تھا۔

دس گیارہ روز ڈھاکہ میں رہنے کے بعد ہم تینوں دوست اب واپس لاہور جا رہے تھے۔ ڈھاکہ ائیر پورٹ سے بلند ہوتے ہی مائیکروفون پر اعلان ہوا۔

''خواتین و حضرات! میں جہاز کے عملے اور کیپٹن قاضی کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ ہم ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے انشاء اللہ دو گھنٹے بیس منٹ کے بعد کولمبو ائیر پورٹ پر اتریں گے۔''

اس اعلان نے میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ میں نے فوراً کافی منگوائی اور کہا۔

''زلفی پیارے! شہر نہ سہی' ائیر پورٹ سہی۔۔۔۔۔۔۔لیکن کولمبو کی سرزمین پر قدم تو رکھیں گے۔''

کافی کے تلخ گھونٹ اور کولمبو کے جزیرائی خیال نے میرے دل کو مرطوب جنگلوں کی گرم خوشبوؤں سے بھر دیا۔ اب میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے خلیج بنگال گزر جائے' ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد شٹر ذرا سا اٹھا کر نیچے جھانک لیتا۔ بادلوں کے سفید گالے اور سمندر کا صحرا۔۔۔۔۔۔۔میں بڑا بور ہو گیا۔

آخر زلفی اور فیضی کے ساتھ ہنسی مذاق اور باتوں میں دو گھنٹے گزر گئے۔ اب جو میں نے شٹر اٹھا کر باہر دیکھا تو دور مغرب کی جانب انڈیا کا ساحل اور دھنش کوڈی کی تکون نظر آئی۔ آج سے بائیس برس پہلے میں اس تکون یعنی دھنش کوڈی کی بندرگاہ سے جہاز پر بیٹھ کر سیلون کی غیر معروف بندرگاہ تالی منار کی طرف روانہ ہوا تھا۔ میرے خیالوں میں پرانی یادوں کی پریاں اترنے لگیں۔ اب ہم سیلون کے جزیرے کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھورے رنگ کے ٹاپو خشکی کے ٹکڑے جنگلوں کے جھنڈ آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ آخر مائیکروفون پر اعلان ہوا۔

''خواتین و حضرات! ہم تھوڑی ہی دیر میں کولمبو کے ہوائی اڈے پر اتر رہے ہیں' برائے مہربانی......''

جہاز بلندی سے نیچے آنا شروع ہو گیا تھا۔ سبز دھبے جنگلوں کے جھنڈوں میں سفید لکیریں دریاؤں میں اور ریت کی لہریں سمندر کی اچھلتی موجوں کا روپ دھار رہی تھیں۔ اب میں ناریل اور تاڑ کے گھنے جنگلوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک چھوٹے سے مضافاتی سٹیشن کو دیکھا۔ پلیٹ فارم خالی تھا' چھوٹی سی لائن دو سیاہ لکیروں کی طرح گزرتی ہوئی جنگل میں گم ہو گئی تھی۔ اسی طرح کا وہ ریلوے سٹیشن تھا جہاں ہماری گاڑی رکی تو ہلکی ہلکی بارش میں پلیٹ فارم کے درخت بھیگ رہے تھے اور ایک سنہالی لڑکی نے میری کھڑکی کے پاس آ کر کہا تھا۔

''پائن ایپل سر۔۔۔۔۔۔۔ویری سویٹ سر۔۔۔۔۔۔۔فائیو سینٹ سر'' مجھے اس سنہالی لڑکی کی سیاہ چمکیلی آنکھیں دودھیا

مسکراتے دانت اور اناناس کی طرح تر و تازہ رس بھرا زرد چہرہ یاد آ گیا۔ ایئر ہوسٹس کافی وغیرہ کی پیالیاں سمیٹتی ہوئی گزر گئی اس کی آنکھیں بھی سیاہ تھیں لیکن اس کی چمک مصنوعی تھی' رنگ زرد تھا مگر اس میں اناناس کی خوشبو نہ تھی۔ ہوائی جہاز نیچے' نیچے اور نیچے ہو رہا تھا۔ ناریل کے جنگل' اناناس کے درخت اوپر' اوپر اور اوپر ہو رہے تھے۔ کولمبو کے آسمان پر دھوپ چمک رہی تھی' پام کی ہری بھری ٹہنیاں۔۔۔۔۔۔کیپٹن قاضی نے جہاز کو بڑی مہارت سے کولمبو کے ایئر پورٹ پر اتار دیا۔ وہ رن وے پر چکر لگا کر ایئر پورٹ کی خوبصورت عمارت کے سامنے آ کر رک گیا۔

سیڑھی لگا دی گئی۔ مسافر نیچے اترنے لگے۔ یہاں ڈیڑھ گھنٹے کا قیام تھا اور لاؤنج میں کولڈ ڈرنکس اور ریفریشمنٹ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سیڑھی کے ساتھ ہی سیلون ایئرویز کی ایک دبلی پتلی سانولے رنگ کی لڑکی' نیلی ساڑھی پہنے کھڑی مسافروں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتے ہوئے ان میں کارڈ تقسیم کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا اور چہرے پر گھرے جنگلوں کا وقار تھا۔ وہ جزیرے کی بیٹی تھی۔۔۔۔۔۔سنہالی جزیرے کی بیٹی!

میں' زلفی اور فیضی ایئر پورٹ کی خوبصورت عمارت کے لاؤنج میں آ گئے۔ سامنے کی دیوار پر آئل کلر میں سنہالی دیو مالا کی تصاویر نقش تھیں ایک سنگ مرمر کے کاؤنٹر پر آ گئے جہاں سیلون کے مختلف نوادرات اور دستکاری کے نمونے برائے فروخت رکھے ہوئے تھے۔ کانسی کے تھال' مہاگنی کے ہاتھی وغیرہ۔ ہم نے ایک ہاتھی پسند کیا۔ کاؤنٹر پر نیلی ساڑھی میں ملبوس ایک لڑکی تھی۔ ہم نے قیمت پوچھی تو اس نے کہا۔ ''تھری ڈالر''

معلوم ہوا وہاں سارا لین دین ڈالر اور پاؤنڈ میں ہوتا ہے۔ ساتھ والا کیبن کتابوں کا تھا اور اس کے ساتھ ہی کاؤنٹر پر سیلون کی بہترین چائے کے ڈبے سجے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک ڈبے کی قیمت پوچھی۔ کاؤنٹر بوائے نے بتایا۔

''فور ڈالر''

سامنے والے کاؤنٹر پر ڈیوٹی فری ٹرانسسٹر ریڈیو' ٹیپ ریکارڈز' امریکی سگریٹ' امریکی شرابیں اور جاپانی کھلونے رکھے تھے لیکن اگر آپ کے پاس پاؤنڈ یا ڈالر نہیں ہی تو آپ کچھ نہیں خرید سکتے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور لاؤنج کے شیشے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور دور ناریل کے درختوں کو تکنے لگا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ سنہری دھوپ اور تیز استوائی ہوا میں ناریل کے درخت جھوم رہے تھے۔ میں محبت کی پرانی یادوں میں گم ہو گیا۔ اگر مجھے ایئر پورٹ سے باہر جانے کی اجازت ہوتی تو میں ٹیکسی لے کر سیدھا بوریلا جنکشن چلا جاتا اور مسز جونیر سے ملتا۔ ٹمپل روڈ کے بدھی مندر کی جالیوں کے ساتھ لگ کر اگربتیوں کی خوشبو سونگھتا اور انا پورنا کے پاس جاتا۔ چاندنی رات میں اسے نندا جھیل کے پاس مہوا اور سال کے گھنے درختوں کے سائے میں کنول کے ہار گلے میں ڈالے رقص

کرتے دیکھتا۔

لیکن میں ایئر پورٹ سے باہر نہیں جا سکتا تھا اور انا پورنا اپنے جنگل سے نکل کر ایئر پورٹ پر نہیں آ سکتی تھی۔ میں شیشے کی بند دیوار کے ساتھ ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں چمکتے ناریل کے درختوں کو دیکھ رہا تھا اور ذرا فاصلے پر پی آئی اے کے بوئنگ میں تیل بھرا جا رہا تھا۔ کولمبو شہر ایئر پورٹ سے آٹھ میل دور ہے اب وہ آٹھ ہزار میل دور تھا اور آٹھ لاکھ میل دور تھا۔

جہاز کو تیل دینے والا ٹرک واپس جا رہا تھا۔ مسافر جہاز میں دوبارہ سوار ہونے لگے تھے۔ میں' زلفی اور فیضی بھی جہاز میں سوار ہو گئے۔

''خواتین و حضرات! ہم ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے انشاء اللہ تین گھنٹے کے بعد کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچ جائیں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ سگریٹ بجھا دیں اور حفاظتی۔۔۔۔۔۔۔''

بوئنگ کولمبو ایئر پورٹ کے رن وے پر پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے گرجا اور شیر کی مانند دھاڑتا ہوا آسمان کی طرف اوپر اور اوپر اٹھتا چلا گیا۔ ناریل کے جنگل پیچھے رہ گئے۔ ماؤنٹ لیونیا کا خوبصورت ساحل سمندر پیچھے رہ گیا۔ باوک پیچھے رہ گئے' کولمبو پیچھے رہ گیا' انا پورنا پیچھے رہ گئی۔ اب ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی تھی۔ سمندر کی بھوری سپاٹ چادر اور کراچی کا انتظار تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور آنکھیں بند کر کے سر پیچھے لگا دیا۔

''سدا خوش رہ سنہالی دیش کی بیٹیو!''

سدا لہلہاتے رہو' لنکا کے ناریل کے درختو! سال اور اناناس کے درختو! ہم نہ ہوئے تو کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔تم تو ہو گے۔۔۔۔۔۔۔انا پورنا تو ہو گی۔۔۔۔۔۔۔روشنی تو ہو گی۔۔۔۔۔۔۔محبت تو ہو گی۔

مغربی پاکستان کے وقت کے مطابق ۲۲ مارچ کی رات کو سوا نو بجے میں کراچی کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ کراچی کی خیرہ کن روشنیاں مجھے بڑی اچھی لگیں۔ جی چاہا کہ ان روشنیوں میں کرن بن کر اتر جاؤں' ان کرنوں میں روشنیوں کا ذرہ بن کر اتر جاؤں۔

معلوم ہوا ہمیں لاہور کے لیے صبح آٹھ بجے فلائیٹ ملے گی۔ پی آئی اے نے ہماری شب باشی کے لیے ہوٹل میں اہتمام کر رکھا تھا لیکن ہم نے مناسب نہ سمجھا کہ اتنا سامان لے کر ہوٹل جائیں اور منہ اندھیرے وہاں سے ایئر پورٹ کو بھاگیں۔ فیاض اور زلفی نے فیصلہ کیا کہ ہم ساری رات ایئر پورٹ پر ہی گزاریں گے۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

ہم نے سارا سامان لاؤنج میں ایک ستون کے ساتھ لگا دیا۔ ایرانی قالینوں کے تین بیش قیمت ٹکڑے بچھائے اور ان پر بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کر دی۔ ساری رات ہم تاش کھیلتے رہے' چائے پیتے اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ دن چڑھ آیا۔ کراچی ایئر پورٹ

سورج کی روشنی میں نہا گیا۔ آٹھ بج کر پانچ منٹ پر ہم کراچی سے اڑے اور نو بج کر بیس منٹ پر لاہور پہنچ گئے۔ لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہمارے چاروں طرف پھول کھل اٹھے ہیں۔ کسٹم گیٹ کے باہر گلاب کھلے ہوئے تھے۔ لاہور کی فضاؤں میں بہار کی خوشبوئیں رچی ہوئی تھیں۔

''نئیں ریساں شہر لاہور دیاں''

◆◆◆

کاسنی ہونٹوں والی

جنوری کی ایک شام بارش ہونے لگی۔

میں اور نواز الیزیم یعنی چینی لنچ ہوم گیلری میں اس کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے جو مال کی طرف کھلتی تھی۔ کمرشل بلڈنگ کی روشنیاں گیلی سڑک پر منعکس ہو رہی تھیں۔ فٹ پاتھ کے درخت سردیوں کی بارش میں بھیگ رہے تھے۔ کسی دوکان کے آگے کار آ کر کھڑی ہوتی' دروازہ کھلتا اور کوئی مرد یا عورت تیزی سے دکان میں گھس جاتی۔ مال پر کاروں کی روشنیوں میں بارش کی بوندیں سنہری کرنوں کی مانند گرتی دکھائی دیتیں۔ سردی بڑھ گئی۔ ہماری کھڑکی کے پٹ بند تھے اور ہم باہر کا نظارہ کھڑکی کے شیشوں سے دیکھ رہے تھے۔ نواز چائے بنانے لگا' میں نے پائپ سلگا لیا۔ چائے کی خوشبو ایرانی اور تمباکو کی لطیف خوشبو سے مل گئی۔ اور فضا میں ایک تیسری خوشبو پھیل گئی۔ کولمبو کے بارے میں میرا ایک افسانہ ''چاندنی اور جزیرے'' رسالہ ''سویرا'' میں تازہ تازہ چھپا تھا۔ میں نے نواز کو کولمبو کی بارشوں' جنگلوں' جھیلوں' دھان کوٹتی سنہالی عورتوں اور ان کے سیاہ جوڑوں میں سجے ہوئے گل مہر کے گہرے سرخ پھولوں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے کہا۔

کندرگام کا قصبہ کولمبو سے کینڈی جانے والی شاہراہ پر کوئی ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کولمبو کے دوسرے بڑے ریلوے اسٹیشن فورٹ سے سبز رنگ کی ایک چھوٹی گاڑی شام کے سات بجے چلا کرتی ہے۔ رات بھر یہ گاڑی سنگاپ کے پراسرار گنجان جنگلوں سے گزرتی ہے۔ پو پھٹنے جب جنوب مشرقی آسمان پر ستارے مدھم ہونے لگتے ہیں کندرگام پہنچتی ہے۔

نواز میری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور باہر مال روڈ پر جنوری کی بارش تیز ہو گئی۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ کندرگام سیلون کے خوبصورت ترین قصبوں میں سے ایک ہے یہاں ایک تاڑی خانہ بھی تھا' اردگرد کے دیہات سے پیدل چل کر آئے ہوئے کسان اور چائے کے باغوں میں کام کرنے والے مزدور ناریل کی چھال کی بوریوں میں' کچے کیلوں کے ڈھیر اور پانوں کی ٹوکریاں بیچ کر یہاں آتے' وہ مٹی کے پیالوں میں تاڑی بھر کر تاڑی خانے کے اندر یا باہر سڑک کے کنارے بیٹھ جاتے۔ پہلا گھونٹ لے کر وہ جلدی سے پیاز اور املی کی تیز مرچوں والی چٹنی چکھتے' کچی لسی کے رنگ ایسی پھیکی اور بدبودار تاڑی کے دوسرے تیسرے گھونٹ پر ہی ان کی آنکھیں لال انگارہ بن جاتیں اور وہ کسی بھی معمولی سی بات پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتے۔

اسی قصبے میں' میں نے پہلی بار اناپورنا کو دیکھا' کندرگام سے ایک پتلی سی پگڈنڈی چائے اور کوکو کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ بل کھاتی کنول پھولوں سے بھری ہوئی پرسکون جھیل نندا تک چلی گئی ہے اسی جھیل کے بارے میں سنہالی لوگ گیتوں میں مشہور ہے کہ یہاں نندا دیوی نے اپنے محبوب دیوتا سورج پوری سے۔۔۔۔۔۔۔ کر بن باس کے بارہ برس کاٹے تھے۔ چاندنی راتوں میں وہ آدھی رات کے بعد ناریل کے پیڑوں تلے بال کھولے اپنے پریمی کی یاد میں آنسو بہایا کرتی کہتے ہیں یہ جھیل اس کے آنسوؤں سے بنی تھی۔ یہ جھیل کافی بڑی ہے اور اس کی سطح پر ہر موسم میں گہرے سبز اور ہلکے سبز رنگ کی بڑی بڑی طشتریوں ایسے گول پتے پھیلے رہتے ہیں ان پتوں کے بیچ میں کنول کے سفید اور بنفشی پھول کھلتے ہیں ان میں کوئی آدھ کھلا ہے کوئی ابھی کلی ہے اور دودھیا منار کی مخروطی برجی کی طرح لگ رہی ہے کوئی کنول پورا کھلا ہے اور بھنوروں کی ٹولیاں اس پر منڈلا رہی ہیں۔ ذرا سی ہوا چلے تو یہ پھول جھیل کی سطح پر ہلکورے لینے لگتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جیسے سانس لے رہے ہوں یہاں اردگرد سال اور سنبل کے گھنے درخت ہیں اور دن کے وقت بھی ان کے سایوں میں اندھیرا سا چھایا رہتا ہے۔ کنارے کنارے بانس اور تاڑ کے درخت ساتھ ساتھ اگے ہیں۔ ان درختوں میں گل مہر کے پیڑوں پر سرخ پھولوں کی چادریں بچھی ہیں۔ سال کے قدآور درختوں کے تنوں میں رتناکلی کی بیلیں لپٹی ہوئی ہیں۔ مئی' جون میں جب اناس پھلوں میں رس آتا ہے اس جھیل پر بڑا زبردست میلہ لگا رہتا ہے۔ سنہالی دوشیزائیں جھیل میں نہا کر چاندنی راتوں میں اپنے سیاہ بالوں میں گل مہر کے سرخ پھول سجاتی ہیں۔ گلے میں کنول کے پھولوں کی مالا ڈالتی ہیں اور پھر شہنائیوں کی لے پر رقص کرتی ہیں' چاندنی میں ان کے گندمی جسم شعلوں کی طرح ابھر کر سایوں میں گم ہو جاتے ہیں اور پھر ابھرتے ہیں۔ گھنگھروؤں کی جھنکار ان کے پاؤں سے بچھڑ کر شہنائی کی آواز کے ساتھ سنگلدیپ کے پہاڑوں' جنگلوں اور باغوں میں گم ہو جاتی ہے۔

رقص کے بعد ان پر ناریل کا پانی اور عطر چھڑکا جاتا ہے۔ میں ان دنوں کولمبو میں تھا اور ایک عجیب اتفاق سے اس قصبے میں پہنچ گیا۔ جس لڑکی اناپورنا کا میں نے ذکر کیا ہے' وہ مجھے اس جگہ ملی۔ جھیل کی پرلی جانب بانس کے جھنڈوں کے پاس وہ ناریل کے پتوں سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں اپنے بوڑھے باپ اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی تھی اس کی ماں مر چکی تھی۔ مئی' جون میں جب تاڑ کے درختوں کی شاخیں میٹھے رس سے بھر جاتیں تو اناپورنا کا چھوٹا بھائی مٹی کا کوزہ لے کر درخت پر چڑھ جاتا' چھری سے درخت کی شاخ کو آدھا کاٹ کر اس کے منہ پر کوزہ باندھ دیتا رات بھر رات کی مستی تاڑی کی خوشبو قطرہ قطرہ بن کر کوزے میں ٹپکتی رہتی۔ پو پھٹے یہ کوزہ اتار لیا جاتا۔ اس میں دودھ ایسے بے داغ سفید رنگ کی گاڑھی تاڑی جمع ہوتی اور اس پر ہلکا ہلکا جھاگ آیا ہوتا۔ تاڑی کا اصل اور غیر نشے والا روپ یہی ہے۔ اناپورنا کے باپ نے صبح صبح مجھے تاڑی پلائی جس کا ذائقہ بالکل ہمارے ہاں کی دہی کی

لسی کی طرح تھا۔ اس کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا ہے اور دھوپ پھیلنا شروع ہو جاتی ہے اس میں نشہ میں پیدا ہونے لگتا ہے۔

میں ان دنوں کولمبو ریلوے اسٹیشن یعنی ریڈیو ایک (R.S.E.A.C) سیلون میں کام کر رہا تھا اور اپنے کارکن ساتھی وی سی او صدیقی کے ساتھ اس علاقے میں سنہالی لوک گیت ریکارڈ کرنے آیا ہوا تھا۔ اناپورنا نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کتنے ہی لوک گیت ہمیں ریکارڈ کروائے۔ ہم نے رات ایک جھونپڑے نما مکان میں بسر کی۔ فرش پر ناریل کی چٹائیاں بچھا دی گئیں اور بس ساری رات باہر جھیل نندا پر چاندنی کھلی رہی اور اندر ہمیں مکھیوں جتنے بڑے بڑے مچھر کاٹتے رہے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو اناپورنا ہمارے لیے چاول کے آٹے کی روٹی اور ناریل کے تیل میں تلے ہوئے انڈے لائی۔ اناپورنا کا رنگ گہرا سانولا اور آنکھیں گلابی تھیں' ہونٹ کاسنی رنگ کے تھے اور ماتھے پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی مندر کی پتھر کی مورتی میرے سامنے آ کھڑی ہوگئی ہے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ اناپورنا ہمیں دیکھ کر بالکل نہیں شرمائی۔ وہ سوائے ٹھیٹھ دیہاتی سنہالی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتی تھی۔ ہم اس سے اشاروں میں بات کرتے وہ ہمارے اشاروں پر بڑا ہنستی۔ وہ ہنستی تو اس کے کنول کے پھولوں جیسے سفید دانت رامیشورم کے موتیوں کی طرح دمکنے لگتے۔

ہم چھ سات روز اس علاقے میں رہے۔ اس دوران میں اناپورنا ہم سے کافی بے تکلف ہوگئی تھی۔ مطلب یہ کہ اب وہ بات کرتے اور ہمیں کہہ دیتے ہوئے جھجکتی نہیں تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کی زبان میں اس سے بات کروں لیکن اس کی زبان اس قدر عجیب و غریب تھی کہ لگتا تھا یہ درختوں' پہاڑوں' جنگلوں اور بارشوں کی زبان ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہ تھا کہ اناپورنا ایسی جنگلوں اور بارشوں کی بیٹی سے درختوں کی ہی زبان میں بات کی جا سکتی تھی۔ ہماری زبان مصنوعی تھی۔ اس کی زبان قدرتی اور سچی تھی۔ اناپورنا بولتی تو محسوس ہوتا پہاڑوں کی ڈھلانوں کے گنجان جنگلوں میں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اناپورنا کسی بات پر میری طرف دیکھ کر ہنستی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ یہ کسی قدیم پراسرار مندر کی دیوداسی ہے۔

آخری روز جب میں صدیقی صاحب کے ساتھ کندرگام سے واپس کولمبو آنے لگا تو اناپورنا کے باپ نے ہمیں بڑی محبت اور خلوص سے الوداع کہا۔ اناپورنا اداس بالکل نہیں تھی بلکہ وہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے بڑا غصہ آیا کہ میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں اور اس سے جدا ہوتے ہوئے بے حد غمگین ہوں اور یہ مسکرا رہی ہے۔ اناپورنا مسکراتی رہی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہماری ٹوکری میں اناس رکھے اور مسکراتی ہوئی وہ ہم سے جدا ہوگئی۔ پھر کبھی نہ ملنے کے لیے جدا ہوگئی۔ آج سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ قدیم

جزیرائی دوشیزائیں کس قدر خندہ پیشانی سے پھر کبھی نہ ملنے کے لیے جدا ہو جاتی ہیں۔

ہم لوگ کولمبو آ گئے۔ پھر کندرگام جانے کا اتفاق نہ ہوا مجھے انا پورنا بہت یاد آتی رہی۔ مجھے وہ اس کی مسکراتی ہوئی صورت آج بھی نہیں بھولتی جب ہم اپنی جیپ میں سوار ہو رہے تھے۔ مدراسی ڈرائیور کا نگری نے انجن سٹارٹ کر دیا تھا۔ انا پورنا اپنے بوڑھے باپ اور بھائی کے ساتھ کچی سڑک کے کنارے بانس کے جھنڈوں کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ ''کس قدر بدذوق لڑکی ہے۔'' میں سوچ رہا تھا۔ اسے جدائی کے آداب کی بھی خبر نہیں' جدا ہوتے وقت تو پلکیں بھیگ جاتی ہیں' دل تیزی سے دھڑکنے لگتے ہیں اور ہونٹ کپکپانے لگتے ہیں اور یہ ہاتھ جوڑ کر الوداع بھی کہہ رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے۔ ہماری جیپ پہاڑی راستوں پر چل پڑی اور انا پورنا کی مسکراتی ہوئی من موہنی صورت بانس' تاڑ' سنبل اور ناریل کے درختوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ گئی۔

الوداع سنیال کے پراسرار جزیروں کی ملکہ! تم ہم سے مسکراتی ہوئی جدا ہو رہی ہو۔ ہم بھی تجھے مسکرا کر یاد کیا کریں گے۔ میں خزاں کے سوکھے پتوں کی طشتریوں میں یادوں کے سرخ گلاب سجا کر ہواؤں کے دوش پر تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔ تم بانس کے جنگلوں' جنگلوں کی بارش اور بارشوں کے جزیروں میں اپنے محبت کرنے والے باپ اور پیارے بھائی کے ساتھ خوش رہو' مسکراتی رہو' ساون کے بادل جب تمہارے جھونپڑے کے اوپر سے مینہ برساتے ہوئے گزریں گے اور کیلے کے پتوں' موتئے کے پھولوں اور کنول کے شگوفوں کی مہک سے بھری ہوئی ہوائیں جب تیرے کاسنی ہونٹوں کو چوم کر گزریں تو ہمیں بھی یاد کریں اور پرسکون' پراسرار جزیرائی رات کے ستارے ناریل کی شاخوں میں چمکنے لگیں تو انہیں کہنا اب ہم کبھی تمہارے دل میں نہیں آئیں گے۔

نواز ہمہ تن گوش سگریٹ سلگائے میری ناکام محبت کی داستان سن رہا تھا اور میں اسے کہہ رہا تھا کبھی کبھی لاہور کی سڑکوں' باغوں' پارکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے دل میں ایک خیال سا ابھرتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اسی ہوٹل میں چائے کا آخری خوشبودار گھونٹ پی کر اپنی تمام ذمہ داریوں' تمام معاشی مسئلوں اور اقتصادی پریشانیوں کا ہاتھ پکڑوں اور سنہالی دیش کی طرف سیلون کی طرف' لنکا کی طرف اڑتا چلا جاؤں اور انا پورنا کے گاؤں پہنچ کر اسے کہوں ۔۔۔۔۔۔ دیکھو انا پورنا' میں تمام زنجیروں سمیت تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ یہ میری چھوٹی پریشانی یہ بڑی پریشانی ہے' یہ چھوٹی زنجیر ہے' یہ بڑی زنجیر ہے۔

میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کاش میں ایسا کر سکتا۔ یقین کرو نواز میں ایک نہ ایک دن ایسا ضرور کر گزروں گا۔ نواز نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا اور میرے لیے چائے بنانے لگا۔ باہر مال پر بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ میرا پائپ بجھ گیا تھا۔ میں نے نیا تمبا کو بھرا۔ پائپ سلگایا اور ایران مور کی خوشبو میں آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ایران مور کی خوشبو نے میری آنکھیں بند کر

دی ہوں۔ میری آنکھوں پر اپنی خوشبودار انگلیاں رکھ دی ہوں۔ میں نے اپنی بند پلکوں پر خوشبو کی انگلیوں کا انا پورنا کی گرم انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔

انور جلال کے قہقہے کی آواز گونجی۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

ہم دونوں خاموش تھے۔ میں رومانٹک ہو رہا تھا۔ نواز اداس تھا۔ انور جلال نے ایک اور قہقہہ لگایا اور نواز کا کندھا ہلا کر بولا۔

''ضرور اے حمید ۔۔۔۔۔۔ اپنی دیوداسیوں کی داستان سنا رہا ہو گا' جب ہی تم دیوداس بنے بیٹھے ہو۔''

انور جلال کے ساتھ ہی ماحول بدل گیا۔ مسرت' خوش وقتی اور خوش خیالی کی مہتابیاں چھوٹنے لگیں اور انا پورنا کا مسکراتا ہوا چہرہ ہماری لطیفہ بازیوں اور فلک شگاف قہقہوں کی آواز میں اور زیادہ مسکرانے لگا۔

جدائی میں خوشی ہے ۔۔۔۔۔۔ انا پورنا کا مسکراتا ہوا چہرہ یہی کہہ رہا تھا۔

◆◆◆

نسیم بانو کی تلاش

امرتسر میں منروا مووی ٹون کی فلم ''میں ہاری'' لگی اور میں نسیم بانو کو دل دے بیٹھا' مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ وہ دل قبول بھی کرتی ہے یا نہیں۔ میں نے تو سینما میں بیٹھے بیٹھے مس نسیم بانو کو پردۂ سکرین پر دیکھا اور اپنا دل اس کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ چھوٹی عمر کے عشق کے بارے میں وارث شاہ صاف فرما گئے ہیں۔

چھوٹی عمر دیاں یاریاں بہت مشکل
پتر مہراں دے کھولیاں چار دے نیں

میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ نسیم بانو کے عشق نے دل کی دنیا میں وہ طوفان محشر اٹھایا کہ ایک روز میں نے بمبئی کا ٹکٹ لیا اور بمبئے ایکسپریس میں سوار ہو کر اپنی محبوبہ کے شہر کو چل پڑا۔ بمبئی میں میرا کوئی واقف کار نہ تھا' نہ میں کسی کو جانتا تھا۔ گھر سے میں نے سو روپیہ چرایا تھا۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد چاندی کے باقی روپوں سے میرے کوٹ کے اندر والی جیب آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ دلی ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر میں نے پلیرز نیوی کٹ کی پچاس سگریٹوں والی ڈبی خریدی' سگریٹ سلگا کر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم کی رونق بھی دیکھ رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ جب میں پہلی بار اپنی محبوبہ کو دیکھوں گا تو میرا کیا حال ہو گا۔ یہ خیال بھول کر بھی میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ بمبئی ایسے بڑے شہروں میں جا کر میں کیا کروں گا' کہاں رہوں گا۔۔۔۔۔۔ اس لیے کہ رہائش کے بارے میں میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ نسیم بانو کے ہاں ہی قیام کروں گا۔ دلی سے گاڑی چل پڑی' نئی دلی سٹیشن پر تھوڑی دیر کو رکی اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ بائیں جانب کورو پانڈووں کے قدیم اور خستہ حال قلعے کی فصلیں کھڑی تھیں۔ میں تھرڈ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ نہ میرے پاس کوئی بستر تھا اور نہ ڈبے میں سونے کو جگہ تھی۔ رات کو گاڑی کے ہچکولے کھاتا بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس سیٹ کے نیچے رکھا تھا جس میں ایک پاجامہ' ایک چپل' ایک پتلون' ٹوتھ برش اور دو قمیضیں تھیں۔ بمبئے ایکسپریس بڑے بڑے شہر پیچھے چھوڑتی بمبئی کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔

بمبئی آ گیا۔ گاڑی بمبئے سنٹرل کے وسیع و عریض پلیٹ فارم پر آن کر رک گئی۔ بمبئی میں برسات کی ہلکی ہلکی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر میں ایک بک سٹال کے پاس کھڑا ہو گیا اور سٹیشن کے صحن میں لگے باغ کو دیکھنے لگا۔ ہرے بھرے گھاس پر جگہ جگہ پھول

ہلکی بارش میں مسکرا رہے تھے۔ لیمنگٹن روڈ بارش میں بھیگ رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر لوگ چھتریاں کھولے آ جا رہے تھے۔ ایک طرف قطار میں بہت سے وکٹوریہ (بگھی) گاڑیاں چمگادڑوں کی طرح سیاہ چھتیں کھولے کھڑی تھیں۔ سرخ رومی ٹوپیوں والے کوچوان برساتیاں اوڑھے اوپر والی سیٹوں پر بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔ میں ایک بگھی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ چیچک بھرے سانولے چہرے والے کوچوان نے مجھ سے پوچھا۔

''کہاں چلو گے بابو؟''

''چترا'' ویکلی کے رسالہ سے میں نے مس نسیم بانو کا ایڈریس زبانی یاد کر رکھا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

''میرن ڈرائیو؟''

''وہاں کس کے پاس جانا ہے بابو؟''

''مس نسیم کے گھر''

کوچوان حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر جھک کر پوچھنے لگا۔

''کون مس نسیم؟''

''وہی جس نے ''میں ہاری'' میں کام کیا ہے۔''

وکٹوریہ والا نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور مجھے وکٹوریہ میں بٹھلا کر بمبئی کی بارش میں بھیگتی سڑکوں پر چل نکلا۔ ایک بازار میں سے گزرتے ہوئے میں نے وکٹوریہ رکوالی۔ ایک ہوٹل میں سے دو کپ چائے منگوا کر ہم دونوں نے پی۔ میں نے کیونڈر کا سگریٹ خرید کر سلگایا اور وکٹوریہ آگے چل پڑی۔ جوں جوں مس نسیم کا فلیٹ کا فاصلہ کم ہو رہا تھا میرا دل جلدی جلدی دھڑکنے لگا تھا۔ ایک پل عبور کرتے ہی وکٹوریہ چوپاٹی کے سامنے آ گئی۔ سمندر کے ساتھ ساتھ میرن ڈرائیو کی خوبصورت اور جدید آبادی فلیٹ دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ دو تین فرلانگ سڑک عبور کرنے کے بعد وکٹوریہ ایک فلیٹ کے سامنے رک گئی۔ وکٹوریہ بان نے اوپر والی سیٹ سے آواز لگائی۔

''یہ رہا مس نسیم کا فلیٹ''

میرا دل دھڑکنے لگا۔ اب کیا کروں۔۔۔۔۔۔ کیا واپس چلا جاؤں؟ لیکن میری محبوبہ دلنواز کا فلیٹ سامنے ہے۔ میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ میں وکٹوریہ سے باہر نکل آیا' کوچوان کو پیسے دیئے اور فلیٹ کی طرف آ گیا۔ نسیم بانو پہلی منزل کے فلیٹ میں رہتی

تھی۔ دروازے پر ایک باوردی پٹھان چوکیدار بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اس سے مس نسیم کے بارے میں پوچھا تو اس نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

''وہ سٹوڈیو میں ہے۔''

جانے کیوں میں نے یہ محسوس کیا گویا میرے عشق کی توہین ہوئی ہے۔ میرے جذبات میں ایک تبدیلی سی آ گئی۔ میں نے وہاں ٹھہرنا پسند نہ کیا اور واپس مڑا' وکٹوریہ والا ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں فلم زدہ ہوں اور پنجاب سے فلم ایکٹر بننے کا شوق لے کر بھاگ کر بمبئی آیا ہوں' مجھے قریب آتا دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔

''بابو! سہراب مودی کے پاس چلیں؟''

اب میں اداس ہو گیا تھا اور مجھے امرتسر یاد آ رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے واپس امرتسر پہنچ جاؤں۔ میں نے کہا۔

''ریلوے سٹیشن واپس چلو۔''

وکٹوریہ سٹیشن کی طرف چل پڑی۔ راستے میں وکٹوریہ بان نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مجھے قائل کر لیا کہ اب جو میں بمبئی آیا ہوں تو مجھے شہر کی جی بھر کے سیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے بمبئی میں رہ کر خوب سیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ وکٹوریہ والا تین دن میرے ساتھ رہا۔ میں نے ایک معمولی سے ہوٹل ''رام بھروسے ہوٹل'' میں ڈیرہ لگا لیا تھا۔ دن بھر میں وکٹوریہ میں بیٹھ کر شہر کی سیر کرتا اور رات کو ''رام بھروسے ہوٹل'' میں آ کر سو جاتا۔ خوب فلمیں دیکھیں۔ ایرانی ہوٹلوں میں وکٹوریہ والے کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیسٹری اڑائی۔ چوتھے روز میرے پیسے ختم ہو گئے اور جیب میں صرف دو چار روپے رہ گئے۔ وکٹوریہ بان غائب ہو گیا۔ ''رام بھروسے ہوٹل'' سے اٹیچی کیس لے کر فٹ پاتھ پر نکل آیا۔

اب میرے سامنے ایک ناواقف سنگدل شہر تھا اور اس کے ٹھنڈے فٹ پاتھ۔ وہ رات میں نے چوپاٹی کے ایک بنچ پر پہلو بدلتے گزاری۔ اگلے روز میں چرنی روڈ کی ایک معمولی لائبریری میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ لائبریری ایک دقیانوسی قسم کی تھی جس کی چھت نیچے جھکی ہوئی تھی۔ اسے ایک ادھیڑ عمر حکیم صاحب چلا رہے تھے۔ وہ کتابیں بیچتے بھی تھے کرائے پر بھی دیتے تھے اور جو وہاں بیٹھ کر مطالعہ کرتا تھا اس سے بھی گھنٹوں کے حساب سے پیسے وصول کرتے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ حکیم صاحب نے مجھے لائبریری میں ملازم رکھ لیا۔ میرا کام الماریوں اور میز کرسیوں کی جھاڑ پونچھ پھٹے پرانے رجسٹروں کی مرمت اور حکیم صاحب کی جڑی بوٹیوں کو چٹو میں ڈال کر کوٹنا تھا۔ حکیم صاحب کے بے شمار بچے تھے وہ دن بھر مجھے پریشان کیا کرتے تھے۔ ایک بچہ باہر سڑک پر جا کر زور سے چیخ مارتا' میں

پرانے رجسٹر پھینک کر بھاگ کر سڑک پر پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ برخوردار ٹرام کے نیچے نہیں آئے محض مجھے سڑک پر بلانے کے لیے چیخے تھے۔ دوسرا بچہ مجھے کام کرتا دیکھ کر کہیں سے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر کوئی تل چٹا پکڑ لاتا اور اسے میرا کالر اٹھا کر پیچھے سے قمیض کے اندر ڈال دیتا۔ تیسرے بچے کا محبوب شغل یہ تھا کہ میرے پاس آ کر چپ چاپ کھڑا ہو جاتا اور تھوڑے وقفے کے بعد دہرائے جاتا۔

''تم کون ہو۔۔۔۔۔۔۔ تم کون ہو؟''

سب سے بڑا بچہ صرف اتنا ہی کرتا کہ میری گود میں آ کر بیٹھ جاتا اور اپنے ہاتھ کا پنجہ پھیلا کر مجھ سے پوچھنے لگتا۔

''میری چھٹی انگلی کہاں ہے؟''

میری آنکھوں کے سامنے حکیم صاحب بوتلوں میں رنگ دار پانی ڈال کر ان کے منہ ڈاٹ سے بند کرتے اور پھر ان پر طرح طرح کی دواؤں کے نام کے لیبل چپکا دیتے۔ میں نے ایک بار پوچھا۔

''کیا پانی سے بیمار اچھا ہو جاتا ہے؟''

حکیم صاحب داڑھی میں انگلیاں پھیر کر مسکرائے۔

''میاں صاحبزادے! بیمار کا عقیدہ اسے ٹھیک کر دیتا ہے۔''

میں رات کو اسی لائبریری میں بڑے گول میز کے نیچے دری بچھا کر سوتا۔ رات بھر تل چٹے میرے اوپر سے ہو کر گزرا کرتے۔ حکیم صاحب کی بیوی بڑی جھگڑالو بدمزاج اور ظالم عورت تھی' حکیم صاحب اس سے ڈرتے تھے۔ مجھے کسی وقت کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتے دیکھتی تو دور سے آواز لگاتی۔

''حرام کی مت کھاؤ' اور کوئی کام نہیں تو غسل خانے کا فرش ہی ڈھو ڈالو۔''

اب یاد نہیں رہا' جانے کون سا تہوار تھا' غالباً رائے بریلی سے حکیم صاحب کی بیوی کے رشتہ داروں کا ٹولہ آن وارد ہوا پھولے ہوئے میلے برقعوں میں لپٹی عورتیں' پان چباتے سوکھے ساکھے آدمی' دھڑا دھڑ اردو بولتے۔۔۔۔۔۔۔ صندوقوں' پان دانوں' خاص دانوں' گٹھڑیوں' پوٹلیوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ حکیم صاحب نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ ان کی بیوی باری باری عورتوں سے گلے ملی۔ دونوں گھروں کے بچے ایک دوسرے کو گھورنے لگے' اس روز مجھے گھر بھر کا اتنا کام کرنا پڑا کہ رات کو میں لائبریری کی میز کے نیچے سونے لگا تو میرا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ ایک ہفتہ بڑے سکون سے گزرا۔ مہمان اور میزبان آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ دوسرے ہفتے کے شروع میں فریقین میں بعض رشتہ داریوں کے مسائل پر کچھ تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ چوتھے ہفتے ایک دن

اچانک جنگ چھڑ گئی۔ دونوں طرف سے طعنوں اور کوسنوں کی خوب سنگ باری ہوئی۔ چنانچہ اسی شام رائے بریلی کا ٹولہ سامان اٹھا کر واپس چلا گیا۔ رائے بریلی کی لڑائی مار کٹائی سے بھرپور مہمانوں میں پندرہ سولہ برس کی ایک سانولی سی' دبلی پتلی سی لڑکی بھی تھی۔ وہ کچھ غمگین سی رہا کرتی اور رشتہ داروں کے لڑائی جھگڑوں میں کبھی حصہ نہ لیتی۔ ایک دن میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں ایک کرم خوردہ رجسٹر کے اوراق جوڑ رہا تھا' کہنے لگی۔

''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر پوچھنے لگی۔

''تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟''

میں پھر بھی نہ بولا۔ اس نے پھر پوچھا۔

''تمہاری کوئی بہن نہیں؟''

میں نے اس کی طرف ایک پل کو دیکھا اور پھر رجسٹر کے ورق جوڑنے لگا۔ وہ جلدی سے بولی۔

''مجھے اپنی بہن بناؤ گے؟''

میں چونک سا پڑا۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں ایک شفاف سی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے بڑی محبت سے کہا۔

''لاؤ میں تمہارا کالر سی دوں' یہ تو بالکل ادھڑ گیا ہے۔''

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔۔ آج نہیں' کل سی دینا۔

وہ ہنسنے لگی۔

دوسرے روز اس نے میرے ادھڑے ہوئے کالر کی مرمت کی۔ میرے بالوں میں تیل ڈال کر خوب مالش کی۔ شام کو چپکے سے دو گلاب جامن دے گئی۔ جس روز وہ جانے لگی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ماں باپ بہن بھائیوں اور سامان کی گٹھڑیوں سے لدی ہوئی بگھی میں چپ بیٹھی مجھے سامان ڈھوتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آخری بار مجھے اداس نگاہوں سے دیکھا اور بگھی ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دی۔

اس کے بعد اس سانولی سے دبلی پتلی غمگین آنکھوں والی لڑکی کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکا اور شاید اس دنیاوی زندگی میں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ لیکن اس کا خیال میری یادوں کے جنگل کا سب سے خوشبودار پھول ہے۔ ممکن ہے آج وہ رانچی' رائے بریلی' الہ آباد' جھانسی' گوالیار یا کانپور کی کسی تنگ و تاریک گلی کے جھکے ہوئے نیم روشن مکان میں بیٹھی ترکاری بنا رہی ہو یا اپنے بچوں کے پھٹے ہوئے کپڑے مرمت کر رہی ہو یا اپنے بیمار خاوند کے پاؤں داب رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کاغذ قلم پھینک کر اٹھوں اور اس گلی میں جا کر دروازے پر آہستہ سے دستک دوں اور جب وہ دروازہ کھولے تو چپکے سے موتیے کے سفید پھول اس کے قدموں میں رکھوں اور پیر چھو کر کہوں۔

''تم نے مجھے پہچانا میری بہن؟''

اور وہ بالکل نہ پہچان سکے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں محبت کے گرم آنسو چھلک اٹھیں۔ میں بھی اس کو نہ پہچان سکوں۔ لیکن میری آنکھیں بھی محبت کے آنسوؤں سے بھر آئیں۔

مگر ایسا نہیں کر سکتا۔ ابھی تو لکھ رہا ہوں' لکھے جا رہا ہوں' گرمیوں کے کپڑوں کے لیے سردیوں کے کپڑوں کے لیے' ٹھنڈی چتلونوں کے لیے' پنساری کے بل کے لیے' بجلی کے بل کے لیے لکھ بھی رہا ہوں اور سوچ بھی رہا ہوں کہ اگر ہماری پھٹی ہوئی قمیضوں کی مرمت کرنے والی یہ نیک دل بہنیں نہ ہوں تو ہم کتنے عریاں ہو جائیں۔ ایش ٹرے میں سگریٹ سلگ رہا ہو۔ میرا سر جھکا ہے اور سیاہ قلم' سفید کاغذ کے بادبانوں پر سفر نصیب محبت کے مرثیے لکھ رہا ہے۔ ایک لہر سے دوسری لہر اٹھ رہی ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال جنم لے رہا ہے۔ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جل رہا ہے اور میں بوسکی کی قمیص پہنے کرسی پر بیٹھا پچیس برس پہلے کا بوسیدہ صندوق کھولے' پھٹی ہوئی قمیص' ادھڑے ہوئے پاجامے اور گھسے ہوئے بوٹ دیکھ رہا ہوں۔ یہ قمیص کہاں پھٹی تھی؟ جوتا کہاں ٹوٹا تھا؟ یہ پیوند کہاں لگا تھا؟ کچھ یاد آ رہا ہے' کچھ یاد نہیں آ رہا۔

ابھی کتنی قمیصیں پھٹیں گی؟

ابھی کتنے جوتے گھسیں گے؟

ابھی کتنے پیوند اور لگیں گے؟

◆◆◆

الوداع لنکا

جن شہروں کی سیاحت میری زندگی میں یادگار رہی ہے ان میں کولمبو کا نام سرفہرست ہے۔ کولمبو پر میں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ایک ناول بھی لکھا ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس گہرے سبز جنگلوں والے پر اسرار جزیرائی شہر کی بارشوں' جنگلوں' استوائی خوشبوؤں والے پھولوں' ساحلی سمندر کی لہروں' وہاں کے محنت کش لوگوں کے زرد چہروں والی شوہر پرست عورتوں اور تیکھی چتونوں والی خانہ بدوش سنہالی دوشیزاؤں کو میں پوری طرح بیان نہیں کر سکا۔ ۱۹۴۷ء میں آوارہ گردی کرتے ہوئے کولمبو پہنچ گیا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور ریڈیو "سی ایک" سیلون یعنی کولمبو کے فوجی ریڈیو سٹیشن سے جنوب مغربی ایشیا کمانڈ کی فوجوں کے لیے تفریحی پروگرام نشر ہوتے تھے۔ اس فوجی ریڈیو سٹیشن کے دو شعبے تھے' انڈین سیکشن اور امریکی سیکشن۔ انڈین سیکشن کے انچارج کیپٹن ممتاز ملک تھے عملے میں صوبیدار پیارا سنگھ اور وائسرائے کمشنڑ آفیسر مسٹر صدیقی تھے۔ ٹرانسمیشن صبح نو بجے شروع ہو کر گیارہ بجے ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد امریکی سروس شروع ہو جاتی۔ ریڈیو سٹیشن کی دو منزلہ عمارت کے بیچ میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں ناریل اور شریفے کے درخت لگے تھے۔ یہ عمارت کولمبو میونسپل ہال کے بالمقابل تھی۔ یہ جگہ بڑی پر فضا تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ سرخ پھولوں والے گھنے درختوں نے سڑک پر چھت سی ڈال رکھی تھی۔ ان درختوں پر سے سرخ پھولوں کی پتیاں گرتی رہا کرتیں۔ ہماری جیپ ریڈیو سٹیشن کے احاطے میں آ کر کھڑی ہوتی تو اس کے بونٹ پر سرخ پھول پڑے ہوتے۔

امریکی سیکشن ہمارے سیکشن کے ساتھ ہی تھا۔ خوش باش اور بے فکرے امریکی اناؤنسر' انجینئر اور نیوز ایڈیٹر وغیرہ خاکی نیکریں پہنے سٹوڈیوز اور کمروں میں گھومتے رہتے۔ ان کے چتکبرے داغوں والے لال لال جسم ٹماٹروں کا خیال آ جاتا۔ ان میں ایک پختہ عمر کی خاتون اناؤنسر مس الزبتھ بھی تھی۔ یہ دراز قد' نیلی آنکھوں والی امریکی خاتون بڑی ہنس مکھ اور کشادہ دل تھی۔ مسز کندا سوامی ایک دبلی پتلی جامنی رنگت والی مدراسی لڑکی دفتر میں ٹائپسٹ تھی۔ وہ گیٹ پر ٹرانسپورٹ آفیسر مسٹر کانگری سے ملیالم یا تلنگو میں باتیں کرتی تو معلوم ہوتا دونوں ایک دوسرے پر پتھر پھینک رہے ہیں۔

ایک روز میں سٹوڈیو میں پینل پر بیٹھا دلی ریڈیو سے نیا نیا آیا ہوا سریندر کور' پرکاش کور کا "سڑکے سڑکے جاندیئے نیارے۔۔۔۔۔۔" پنجابی ڈسک ٹیسٹ کر رہا تھا کہ مس الزبتھ اندر آ کر پنجابی گیت کو غور سے سننے لگی۔ وہ گیت کی لے اور تال

سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یہ پنجاب کا لوک گیت ہے تو وہ خوشی سے اچھل کر بولی۔

Oh My Love folk songs

وہ میرے سامنے پینل پر جھک گئی اور اب میری ایک آنکھ گھومتے ہوئے ریکارڈ پر تھی اور دوسری آنکھ الزبتھ کے گریبان پر' جہاں گلابی مخمل سے پھول بنا ہوا تھا' وہ خود بھی گلابی مخمل کی بنی ہوئی تھی اور اس کا ادھ کھلا گریبان۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اسے رہنے دیں' اس لیے میں یہاں یادوں کے گلاب کا تذکرہ کرنے بیٹھا ہوں' گلابی مخمل کا نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جتنی دیر وہ پینل پر جھکی رہی' مجھے پونڈز کی ٹھنڈی مہک کے ساتھ پکی ہوئی خوبانیوں کی میٹھی خوشبو آتی رہی۔

ریڈیو سٹیشن کی لابی میں داخل ہوتے ہی مسز اوپلے کی صورت دیکھنا پڑتی' ٹیلی فون ایکسچینج کی مشین کے سامنے بیٹھی یہ ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم جامنی رنگ عورت ہر ایک سے دو چار باتیں ضرور کرتی۔ وہ امریکی بوڑھی عورتوں کی طرح جبڑے کھول کر پاگلوں کی طرح ہنستی اور اس کے مصنوعی دانت سارے کے سارے ننگے ہو جاتے اور کافی ادھیڑ عمر تھی اور اب اس کے مصنوعی دانت بھی ہلنے لگے تھے۔ وہ بالوں میں بے حساب خضاب لگاتی۔

ولیم ہریس امریکی میوزک کمپوزر تھا۔ ایک روز صدیقی ریڈیو پروگرام پر پنکج ملک کا اس زمانے کا مشہور ریکارڈ "پیا ملن کو جانا" سن رہا تھا کہ اس کے انٹرول میوزک کے ستار کو سن کر ولیم ہریس بے اختیار ہمارے کمرے میں آ گیا اور ستار کی دھن پر رقص کرنے لگا۔ وہ ہم سے ریکارڈ مانگ کر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کمرے میں ریڈیو گرام پر وہی ریکارڈ لگا رکھا تھا اور خود میز پر بیٹھا ستار کے ٹکڑے کی نوٹیشن لے رہا تھا۔ ہم برما' جاپان وغیرہ کے مفتوحہ علاقوں میں مقیم فوجیوں کے لیے پنجابی' نیپالی' تامل' تلنگو' اردو اور مرہٹی فلمی گانوں کے ریکارڈ بجایا کرتے تھے۔

کولمبو شہر سے بھی عورتیں اور مرد اپنے پسند کے فلمی گیت سننے کے لیے بے شمار فرمائشی خطوط لکھتے۔ ہم ان کے ناموں کا اعلان تو نہ کرتے مگر ان کے پسند کے ریکارڈ بجا دیتے۔

صوبیدار گلستان خان ضلع چکوال یا جہلم کا اونچا لمبا ادھیڑ عمر کا فوجی تھا' بہت کم بات کرتا۔ وہ نماز کا بڑا پابند تھا۔ صوبیدار موہن سنگھ سر سے پاؤں تک وہ آپے کا سکھ تھا وہ ملٹری گیریژن کی بارک میں رات کو شراب کے نشے میں دھت ہو کر میرٹھ شہر کے مرنجا مرنج اور انتہائی وضع دار شریف النفس صدیقی صاحب کے گرد ہو جاتا۔ بال کھولے' کچھا پہنے وہ اپنی توند کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ڈکار مارتے ہوئے صدیقی صاحب کے پلنگ پر بیٹھ کر کہتا۔

''صدیقی جی ذرا اردو تو سناؤ سوہنیو'' صدیقی صاحب پیارا سنگھ سے بڑے پریشان تھے۔ انہوں نے کیپٹن ملک سے کئی بار کہا تھا کہ انہیں ملٹری گیریژن سے کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ آخر ایک روز انہوں نے بوریا بستر اردلی کے سر پر رکھوایا اور وہاں سے بھاگ کر ایک ہوٹل میں پناہ لی۔

اس روز صوبیدار پیارا سنگھ نے بھی غضب کر دیا' اسے زیادہ ہی چڑھ گئی تھی۔ شراب وہاں فوجیوں کو عام اور انتہائی سستے داموں ملتی تھی۔ پیارا سنگھ بہت پی گیا اور حسب عادت نشے میں دھت ہو کر صدیقی صاحب کے گرد ہو گیا' وہ پلنگ پر چڑھ کر بھالو کی طرح اچھلنے لگا اور مکا لہرا لہرا کر کہتا۔

''ہور بول اُردو۔۔۔۔۔۔۔۔ اردو۔۔۔۔۔۔۔۔ ہائے اردو۔۔۔۔۔۔۔''

ہم بوریلا جنکشن کے چوک میں رہتے تھے' یہاں آلمس سٹریٹ میں ''آلمس پیلس'' نام کی ایک کوٹھی کا آدھا پورشن کیپٹن ملک نے لے رکھا تھا' یہ کوٹھی مسٹر اور مسز جونز کی ملکیت تھی۔ یہ لوگ ڈچ تھے اور ان کے آباءواجداد ہالینڈ سے آ کر وہاں آباد ہو گئے تھے۔ مسٹر جونز بڑے شائستہ اور شریف الطبع انسان تھے۔ وہ ''سیلون ٹی'' کے سیلز مینجر تھے۔ گول مٹول چہرے والی ادھیڑ عمر مسز جونز ۔۔۔۔۔۔دل کی بڑی نیک اور زبان کی بڑی کرخت تھی' وہ ہندوستانی بڑی روانی سے بول لیتی تھی۔ ایلن اور ڈیوڈ اس کے دولڑکے تھے۔ شام کو کوٹھی کے لان میں ان لوگوں کی محفل لگتی تھی۔ سامنے والی کوٹھی سے مس جونز کا کانا انجینئر رشتے دار اس کی بطخ ایسی گردن والی منگیتر اور اس کی موٹی بے ڈول ماں اور بوڑھا باپ بھی آ جاتا۔ کولمبو میں دیسی شراب کو ''عرق'' کہتے ہیں۔ عرق کی بوتلیں میز پر کھل جاتیں' رات کے نو دس بجے میں گھر آتا تو کوٹھی کے لان میں دلچسپ نقشہ ہوتا۔ لابی کے چھوٹے بلب کی دھیمی روشنی میں کانا انجینئر نشے میں اپنی طوطے ایسی گردن کو بار بار گھما رہا ہوتا۔ مسٹر جونز گلاس پر جھکا جھولتے ہوئے کانے انجینئر کی ماں سے ڈچ زبان میں بہک بہک کر باتیں کر رہا ہوتا اور اس کا شوہر مسز جونز کے سگریٹ سے سگریٹ جلا رہا ہوتا۔ میں کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھوتا۔ کھانے کی میز پر مجھے مسز جونز کی ممتا بھری آواز سنائی دیتی۔

''اور مسٹر حامید!''

شراب پی کر اس کی آواز میں بڑی ممتا آ جاتی اور نرم گداز چہرہ کی شفقت کی روشنی سے چمکنے لگتا۔ میں اٹھ کر باہر جاتا تو وہ مسکرا کر کہتی۔

''پلیز مسٹر حامید' میرے والا برانڈ کا سگریٹ!''

اور میں اسے اندر سے اس کی پسند کے سگریٹ ''سینئر سروس'' کا ڈبل پیکٹ لا کر دے دیتا۔ مارکیٹ میں یہ سگریٹ بڑا مہنگا تھا۔ مگر ہمیں فوجی سٹور یعنی ''نافی'' سے سینئر سروس سگریٹ کا ڈبل پیکٹ اس زمانے میں چار آنے میں ملتا تھا۔ گولڈ فلیک کا ٹن دس آنے میں اور چرچ مین ''کریون اے'' کا ٹن بارہ آنے میں ملتا۔ سگریٹ کا پیکٹ لے کر مسز جونز خوشی سے جھوم کر میرا ہاتھ چوم لیتی اس کے ممتا بھرے پیار کا لمس آج بھی میں اپنے ماتھے پر محسوس کرتا ہوں وہ زبان کی کڑوی تھی مگر دل کی بڑی میٹھی اور رحم دل تھی اس نے لڑکی کے علاوہ مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ ایک روز ہمارے چٹاگامی خانساماں کے ہاتھ سے خریدی ہوئی مرغی نکل کر مسز جونز کی مرغیوں میں جا ملی۔ خانساماں نے غلطی سے مسز جونز کی مرغی پکڑ کر پاؤں میں دبوچی اور کلمہ پڑھ کر ابھی چھری چلائی ہی تھی کہ مسز جونز نے چیخ مار کر اس سے مرغی چھین لی۔

''یہ ہمارا مرغی ہے۔''

ہم سب نے جا کر مسز جونز سے معذرت کی فوراً جونز زخمی مرغی کو اندر لے گئی۔ ڈیٹول سے اس کی گردن کا زخم دھویا۔ مرہم لگا کر پٹی باندھی' کورومائن کا انجکشن دیا۔ اس روز ساری رات مرغی کو ساتھ لگائے لیٹی رہی۔ صبح میں ریڈیو سٹیشن جانے لگا تو میں نے زخمی مرغی کو کرسی پر مسز جونز کی گود میں بیٹھے دیکھا' اس کی گردن پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور مسز جونز اسے دلیا کھلا رہی تھی۔

ماؤنٹ لیونیا بیچ کولمبو کے سمندر کا حسین ترین قدرتی ساحل ہے۔ میں اور صدیقی اکثر ماؤنٹ لیونیا کلب کی دوسری منزل کے کھلے صحن میں بیٹھ کر سیلون ٹی پیا کرتے۔ اگر آپ نے مشہور برطانوی فلم ڈائریکٹر ڈیوڈ لین کی فلم ''دی برج آن دا ریور کرائی'' دیکھی ہے تو وہ ساحل سمندر بھی دیکھا ہو گا جہاں ولیم ہولڈن اپنی محبوبہ کے ساتھ سمندر میں نہاتا ہے۔ یہ ماؤنٹ لیونیا کے بیچ تھی اور ساحل سمندر کی جس عمارت کے کمرے میں بیٹھ کر جیک ہاکنز' ولیم ہولڈن کو دوبارہ جاپانی مفتوحہ علاقے میں جانے کا حکم دیتا ہے وہ ماؤنٹ لیونیا کلب کی ٹیرس (Terrace) تھی۔

میں اور صدیقی سیلون کی سنہری تلخ اور خوشبودار چائے پی رہے ہوتے۔

ناریل کے جھومتے جھنڈوں کی قطار ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھی۔ سمندر میں یورپین اور اینگلو سیلونی عورتیں نہا رہی ہوتیں۔ استوائی سورج کی دھوپ میں ان کے گیلے سرخ وسفید جسم چمک رہے ہوتے۔

کولمبو میں ان دنوں فلم ''رتن'' شاید پچاسویں ہفتے میں چل رہی تھی۔ شہر کے اندر چائے خانوں قہوہ خانوں میں یہ نغمے ضرور سنائی دیتے۔

''مل کے بچھڑ گئی اکھیاں۔۔۔۔۔۔۔ہائے رام مل کے بچھڑ گئی اکھیاں''

''ساون کے بادلو۔۔۔۔۔۔۔ان سے یہ جا کہو''

دی گال کولمبو کی سب سے عظیم شاہراہ ہے۔ ہماری شارع قائد اعظم سے چار گنا بڑی یہ سمندر کے ساتھ میلوں چلی گئی ہے۔ جس طرح ہم ٹھنڈی سڑک کو دی مال کہا کرتے تھے اسی طرح اس سڑک کو دی گال کہا جاتا ہے۔ ایک طرف اونچی اونچی بلڈنگیں ہیں اور دوسری جانب کوٹھیاں ہر چھ سات کوٹھیوں کے بعد ایک پتلی سی سڑک سمندر کی طرف چلی گئی ہے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے رات کو سمندر کی موجوں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح سڑک پر کولمبو کا اس زمانے کا سب سے بڑا ہوٹل گال فیس تھا' اس ہوٹل میں غیر ملکی سربراہوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

چوک بوریلا جنکشن میں ایک چھوٹی سی بدھی خانقاہ تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے اگربتیوں کے تیز مہک سنہالی زبان میں بدھی بھجن گانے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ ایک روز میں نے دیوار کے جھرنوں سے جھانک کر دیکھا۔ سنہالی عورتیں کانسی کے تھالوں میں ناریل اور سفید کنول کی کلیاں رکھے لوبان سلگائے دوزانو ہو کر گوتم بدھ کی مورتی کے سامنے بھجن گا رہی تھیں۔ ان کے بھجن گانے کا انداز کرناٹک سنگیت سے ملتا جلتا تھا۔

پیٹہ (Pettah) کا علاقہ کولمبو شہر کی گنجان آبادی میں ہے اور یہ وہاں کی اکبری منڈی ہے۔ یہاں کے کاروبار پر کاٹھیاوار اور مدراس کے مسلمان موپلے چھائے ہوئے تھے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور کولمبو کی بہترین مسجدیں اسی علاقے میں تھیں۔ رمضان المبارک کے مہینے یہاں راتوں کو جگانے والوں کی ٹولیاں اردو اور گجراتی میں نعتیں پڑھتی نکلا کرتیں اور شب معراج کو مسجدوں میں چراغاں ہوتا اور فضائیں درود و سلام سے گونجا کرتیں۔ اسی علاقے میں' میں نے ایک دوکان کے باہر ''لنکا واشنگ فیکٹری'' کا بورڈ لگا دیکھا۔ سارے کولمبو میں ''لنکا'' کا نام پہلی بار میں نے اسی بورڈ پر لکھا ہوا پایا' ورنہ کولمبو میں کوئی شخص بھی لنکا کے نام سے واقف نہیں۔

یہاں تک لکھا تھا کہ سیلون کے ایک جوان' دبلے پتلے' انٹلیکچوئل امریکی نیوز ایڈیٹر لیفٹیننٹ (میں اس کا نام بھول گیا ہوں) کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے۔ یہ گہری فکر انگیز' چمکیلی آنکھوں والا نوعمر لیفٹیننٹ امریکی' اشتراکیت پسند تھا۔ کولمبو میں جو مختلف مزدور یونینیں تھیں ان کے جلسوں میں باقاعدگی سے جاتا۔ مجھے جو اس کی بات یاد ہے وہ یہ ہے کہ ایک روز میری میز پر اپنے ہاتھ میں انگریزی کی ایک کتاب لے کر آیا اور پنسل ایک لفظ پر رکھتے ہوئے بولا۔

''مسٹر حامید! یہ لفظ پنجاب ہے یا۔۔۔۔۔۔؟''

کیپٹن ملک کے ہاں بچی پیدا ہوئی تو انہوں نے بچی کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس کی خدمات حاصل کر لیں۔ ہالینڈ سے اس سنہری بالوں اور چوڑے نتھنوں والی لال سرخ نرس کا نام مس ڈی لال پول تھا۔ وہ کوٹھی کے برآمدے میں بچی گود میں لیے آرام کرسی پر بیٹھی ہوتی اور اس کا بوائے فرینڈ کوٹھی سے ذرا دور ناریل کے درخت تلے کھڑا اسے اشارے کر رہا ہوتا۔ وہ اسے فوراً بلاتی اور لابی میں بیٹھ کر دونوں کافی پیتے' سگریٹ پھونکتے۔ مس ڈی لال پول ہمارے مدراسی نوکر کرشنن کو بار بار آواز دیتی۔

''کرشنن! صاحب سے تھوڑا سگریٹ لا' تھوڑا بسکٹ لاؤ۔'' یہ کرشنن بھی کمال کا نوجوان تھا۔ دبلا' پکا برہمن' دن میں ہر بار کھالے سے غسل کرتا' مارکیٹ سے ۳۵ سینٹ یعنی چونی میں تازہ بہ تازہ اناس لاتا اور پلیٹ میں رکھ کر چھری سے پلک جھپکنے میں اس کا چھلکا اتار کر یوں قتلے کر کے رکھ دیتا کہ قتلے الگ اور میٹھا پانی الگ ہو جاتا۔

دو ماہ بعد مس ڈی لال پول چلی گئی۔ جاتی دفعہ کیپٹن ملک نے اسے چینی چاکلیٹ' چائے' سگریٹ' ڈی کمل کریم' ڈی ماؤس' فرنچ وائین اور پورٹ وائین کی بوتلوں سے لاد دیا۔ وہ خوشی سے نہال ہوئی جا رہی تھی اور اس کے سرخ چوڑے نتھنے فرط جذبات سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اب پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور کولمبو کے اخبارات میں امرتسر کے بارے میں بڑی تشویش انگیز خبریں آنے لگی تھیں۔ میں امرتسر کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ میں نے صدیقی صاحب کے ساتھ جا کر ٹکٹ خرید لیا۔ صبح ساڑھے دس بجے کولمبو ایکسپریس میں سوار ہو کر تالی منار سٹیشن کو جانا تھا۔ سیلون کے گھنے جنگلوں میں ایک دن اور ایک رات کا سفر۔۔۔۔۔۔۔ تالی منار سے سٹیمر میں بیٹھ کر خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب کے گلے ملتے سیاہ اور نیلے پانیوں سے گزر کر ہندوستان کی بندرگاہ دھنش کوڈی تک پہنچا تھا۔ وہاں سے ایک رات اور ایک دن کا سفر طے کر کے مدراس پہنچنا تھا۔ مدراس سے گاڑی میں بیٹھ کر دو دن اور دو رات کے بعد دلی سے پنجاب میل میں سوار ہو کر امرتسر پہنچنا تھا۔ صدیقی صاحب میرے ساتھ تھے۔ ہم اس رات سینما دیکھنے گئے۔ کولمبو کے اعلیٰ ترین اور خوبصورت ترین سینما ہال پلاڈیم میں جون ویئن کی فلم ''Reap the Wild Wind'' لگی تھی۔ ہم دونوں گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ انٹرول ہوا تو پیچھے سے ایک غیر ملکی نسوانی آواز آئی۔

''ہیلو مسٹر حامید!''

میں نے اور صدیقی نے مڑ کر دیکھا' یہ مس ڈی لال پول تھی جو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر ہمارے پاس آ گئے۔ صدیقی نے مس ڈی لال پول کو بتایا کہ حامید کل کولمبو سے واپس وطن جا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے' بڑی اچھی طرح

یاد ہے کہ مس ڈی لال پول بڑی خوش ہوئی' اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور مسکرا کر کہنے لگی۔

''اوہ آئی سی۔۔۔۔۔۔''

دوسرے روز کولمبو کے سب سے بڑے سٹیشن فورٹ پر صدیقی مجھے الوداع کہنے آیا۔ میں کمپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا' اس سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ پیار محبت کی باتیں' جدا ہونے اور پھر بھی کبھی ملتے رہنے کی باتیں۔ انجن نے وسل دیا' صدیقی صاحب باہر نکل گئے' گاڑی پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ گاڑی آگے نکل گئی میں ہاتھ ہلاتا آگے نکل گیا۔ صدیقی صاحب ہاتھ ہلاتے پیچھے رہ گئے۔ اب میرے سامنے سیلون کے سیاہ گھنے' گہرے جنگل تھے اور جزیرے کی تاریک رات' گاڑی برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ سونے کی لنکا مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی۔ آدھی رات کو میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانکا۔ اندھیرا' جنگل۔۔۔۔۔۔

جنگل' اندھیرا۔۔۔۔۔۔!

محبت کی خوشبوؤ۔۔۔۔۔۔ محبت کی مسکراہٹو!

لنکا کی لڑکیو۔۔۔۔۔۔ لنکا کے درختو۔۔۔۔۔۔ درختوں کے گیتو!

الوداع۔۔۔۔۔۔ الوداع!

◆◆◆

زرد گلاب کی ہیروئن

اب ہم مصری شاہ میں آ گئے تھے۔

مصری شاہ ریلوے لائن کے پار ایک گنجان آباد علاقہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی پیچ دار گلیوں کا محلوں میں جال بچھا ہے۔ مکانوں کی ڈیوڑھیاں ٹھنڈی اور نیم تاریک ہیں۔ جس گلی میں ہمارا مکان تھا' وہ ذرا کشادہ تھی۔ بیٹھک کے جالی دار دروازے کے باہر دھریک کا ایک گھنا درخت تھا جس پر چیت وساکھ کے مہینوں میں کاسنی رنگ کے پھول کھلتے تو ان کی خوشبو ساری گلی میں پھیل جاتی۔ سرِ شام گلی میں اندھیرا ہو جاتا اور چوتھے گھر کی ایک بوڑھی عورت دونوں ہاتھ پھیلائے اپنی مرغیوں کو گھیر کر دروازے کی طرف لے جایا کرتی۔ میری بیٹھک میں ایک پلنگ تھا جس پر صاف ستھرا بستر بچھا رہتا۔ کارنس پر کچھ کتابیں اور گلاب کے تازہ پھول سجے رہتے۔ جالی دار کھڑکی کے ساتھ ایک میز لگی تھی۔ اس میز پر بیٹھ کر میں نے اپنا ناول ''جنگل روتے ہیں''' ''دھوپ اور شگوفے'' اور ''جھیل اور کنول'' لکھا۔ ''یروشلم یروشلم'' افسانہ بھی اسی جگہ بیٹھ کر لکھا۔ مکان کے عقب میں ایک مختصر سا پختہ صحن تھا۔ جس کے آدھے حصے پر انگور کی بیل نے اپنا سایہ کر رکھا تھا۔ ستمبر کے مہینہ میں بیل پر پھل لگتا تو میری والدہ آپو جی انگور کے گچھوں پر کپڑے کی تھیلیاں چڑھا دیتیں۔ دادا جان اسی بیل کے نیچے بوریا بستر بچھائے مزے سے بیٹھے رہتے۔ کشمیری چائے پی کر اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے اور مسکرا کر کہتے۔

''سبحان اللہ''

آرٹسٹ بھائی نے مری میں ڈیرہ جما لیا تھا۔ وہ لاہور کی گرمی گرد و غبار اور شور و غل سے تنگ آ گیا تھا۔ بہار کی صبحوں کو وہ لارنس باغ' ریلوے سٹیشن اور ایمپریس روڈ سے ہو کر جاتا۔ ایک روز واپس آیا تو ہاتھ میں آلوچے کے گلابی شگوفوں سے لدی ہوئی بڑی سی ڈالی تھی۔ میری چھوٹی بہنوں نے روز پانی بدلا بدلا کر ان شگوفوں کو گلدان میں چھ سات روز تک تازہ رکھا۔

میں ہر صبح کو اپنی بہنوں کے ساتھ مل کر مکان کے تینوں کمروں کے فرش دھوتا۔ دروازوں' کھڑکیوں' میز کرسیوں اور کتابوں کی جھاڑ پونچھ کرتا۔ گلدان کا پانی بدلتا اور اپنی بیٹھک میں اگربتیاں سلگا دیتا۔ اس کے بعد نہا دھو کر کپڑے پہن ٹی ہاؤس کی طرف روانہ ہو جاتا۔ مصری شاہ سے آگے شاد باغ کے مشرق میں کھیتوں کا سلسلہ شالامار باغ تک چلا گیا تھا۔ یہاں آم کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ رنجیت سنگھ کے وقتوں کی ایک پرانی حویلی تھی۔ جس کی شہ نشینوں کو آم کی ٹہنیوں نے چھپا رکھا تھا۔ سچے گلابوں کے کھیت تھے۔ جن کے گرد خاردار باڑ لگی تھی۔ میں چونکہ اذان کے وقت سیر کرنے جاتا' اس لیے سچے گلابوں کی ڈالیاں توڑ کر بڑی آسانی سے لے آتا۔ ان

کھیتوں اور باغوں میں صبح کی خوشگوار اور تر و تازہ سیریں میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ سردی ہو یا گرمی' میں اذان سے کچھ دیر پہلے اٹھ بیٹھتا' فلیٹ شوز پہنتا اور منہ اندھیرے وسن پورہ کی آبادی سے گزر کر کھلے کھیتوں میں نکل آتا۔ میں لمبے لمبے سانس لیتا اور میرا وجود خوشی کی پرسکون لہروں سے بھر جاتا۔ میں جسمانی صحت برقرار رکھنے کے لیے سیر کرنے نہیں جاتا تھا' نہ اس لیے سیر کرتا تھا کہ میرا معدہ ٹھیک رہے اور خوب بھوک لگے بلکہ یوں لگتا تھا کہ سرسوں کے ہرے بھرے کھیت' بیچے گلاب' آم کے درخت اور کنویں کے آس پاس کیاریوں میں لگے ہوئے کیسری گیندے کے پھول مجھے اپنی طرف بلاتے ہیں۔ جب میں اپنا چہرہ شبنم سے بھرے ہوئے پھولوں کے قریب لے جاتا تو مجھے وہ سانس لیتے محسوس ہوتے۔ جب میں اپنے ہونٹ ان کی شبنمی ٹھنڈی پنکھڑیوں پر رکھتا تو ان کی خوشبو سرگوشیوں میں مجھے کچھ کہتی محسوس ہوتی۔ کھیتوں میں داخل ہوتے ہی میں اپنے ربڑ کے جوتے اتار کر ایک درخت کے نیچے رکھ دیتا۔ پائنچے چڑھا لیتا اور ننگے پاؤں پگڈنڈیوں کی ٹھنڈی مٹی پر دور دور نکل جاتا۔ سردیوں میں میرے پاؤں اوس میں بھیگ کر سن ہو جاتے۔ ہاتھ کی انگلیاں شبنم چہرے پر مل کر یخ ہو جاتیں۔ پھر مشرق کی طرف سے سورج کا سنہری تھال ابھرنے لگتا۔ میں طلوع ہوتے سورج کی طرف منہ کئے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جاتا اور مجھے یوں لگتا کہ گویا یہ سورج کھیتوں میں نہیں میرے دل میں طلوع ہو رہا ہے۔ مجھے آنکھوں کے اندر اس کی ملکوتی روشنی پھیلتی دکھائی دیتی اور میں آنکھیں نہ کھولتا کہ کہیں یہ روشنی غائب نہ ہو جائے۔

چیت وساکھ کے دنوں میں پرانی حویلی والے آم کے ذخیرے سے آگے ناخوں کے باغ میں سفید شگوفے کھلتے۔ ایک روز سیر سے واپس آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ناشپاتی کے شگوفوں سے بھری ہوئی ایک ڈالی تھی۔ کھیتوں میں ایک کسان ملا۔ ناشپاتی کی ڈالی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''باؤ جی! ڈیڑھ سیر ناخیں توڑ کر لیے جا رہے ہیں۔''

اتوار کی اتوار صبح دس بجے میری بیٹھک میں ایک محفل لگا کرتی۔ اصغر سلیم' احمد مشتاق' مظفر علی سید' شہرت بخاری' منیر نیازی' نواز' حسن طارق' انور جلال' اختر عکسی اور بقا نقوی میرے گھر آ تے۔ سبز چائے کا سماوار گرم ہو جاتا۔ اگر بتیاں سلگا دی جاتیں۔ پھولوں سے بھرا ہوا گل دان میز پر رکھ دیا جاتا۔ اور ہز ماسٹرز وائس کے گراموفون پر سہگل' کانن والا' پنکج ملک' جوتھیکا رائے اور جگ موہن کے گیت گونج اٹھتے۔ کیدار شرما کی فلم ''جوگن'' کا ان دنوں لاہور میں چرچا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں نے خاص طور پر منگوا رکھے تھے۔ نواز کیپٹن کا سگریٹ سلگا کر بڑے سکون سے گراموفون میں چابی بھرتا۔ ریکارڈ کو رومال سے صاف کرتا اور مشین چلا کر ساؤنڈ بکس کی سوئی گھومتے ہوئے ریکارڈ پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ سب دوست خاموش ہو جاتے اور پھر بیٹھک کی اگر بتیوں اور گلاب کی خوشبوؤں سے بھری ہوئی فضا میں گیتا دت کی آواز ابھرتی۔

''ہے ری میں تو پریم دیوانی

میرا درد نہ جانے کو

سولی اوپر سیج ہماری

سونا کس بدھ ہو

گگن منڈل پر سیج پیا کی

ملنا کس بدھ ہو''

بھجن کے دوران سبھی خاموش رہتے۔ بیچ میں کسی کسی وقت اصغر سلیم گولڈ فلیک کا کش لگا کر اپنی لال لال آنکھیں کھولتا اور ہم سب کو ایک پل کے لیے گھور کر پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ ریکارڈ ختم ہوتا تو مظفر علی سید میرا بائی کی' بھجنوں اور اس کے فلسفہ عشق اور خود سپردگی پر بحث شروع کر دیتا جسے اختر عکسی یہ کہہ کر خاموش کرا دیتا۔

''شیخ جی! ایہ کتاب لپیٹ لؤ نواں توانگن لگا جے''

فلم سنگدل کا یہ گانا ہم بار بار سنا کرتے۔

''درشن پیاسی آئی داسی

جگ جگ دیپ جلائے

پربھو چرنن کی دھول ملے تو

جیوں میں سکھ پائے''

آپو جی سماوار' پیالیاں' باقر خانیوں اور کھنڈ قلچوں کا طشت مجھے اندر پکڑا دیتیں اور سبز چائے کا دور شروع ہو جاتا۔ سبز چائے' گلاب کے پھول' اگر بتیوں کی خوشبو' میرا کے بھجن' سہگل اور کانن والا کی آوازیں اور منیر نیازی' اصغر سلیم' شہرت بخاری' احمد مشتاق اور بقا نقوی کی تازہ تازہ غزلیں۔۔۔۔۔۔ان محفلوں کی مہک آج بھی میرے دماغ میں ہے۔ وہ قہقہے آج بھی میرے کانوں میں محفوظ ہیں اور وہ دمکتے' پرسکون زندگی سے بھرپور رومانٹک چہرے آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کسی وقت آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہ خوشبوئیں پھر سلگ اٹھتی ہیں۔ وہ آوازیں پھر سنائی دینے لگتی ہیں۔ دھریک کے گھنے درخت والا پرانا مکان مجھے اپنی طرف بلاتا ہے اور جیسے ماضی کے جنگلوں سے قدیم خانہ بدوشوں کے گیت کی آواز سنائی دیتی ہے۔

سنو! مدھر تانوں میں کوئی

اپنے پاس بلاتا ہے

ہرے بھرے اس بن میں کوئی
گیت سہانے گاتا ہے

پت جھڑ کی سرد راتوں میں چاند نکلتا تو انگور کے خشک پتے صحن کے فرش پر گرنے لگتے۔ گھر کے سب لوگ سو رہے ہوتے۔ لیکن میں' حسن طارق اور نواز باورچی خانے میں چائے دم کئے بیٹھے خلیل جبران اور کرشن چندر کے ناول ''شکست'' پر باتیں کر رہے ہوتے۔ باورچی خانے کے دھیمے بلب کی روشنی میں' میں جبران کی کتاب' 'اس نے کہا'' کھول کر پڑھنے لگتا۔ اور صحن میں زرد چاندنی' داخ کی خشک شاخوں میں ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ پھر میں کرشن چندر کے جملے زبانی سناتا اور ہمارے چہرے گرم ہو کر سورج کی طرح چمکنے لگتے۔

''ونتی! ونتی! دیکھ شہتوت کے درختوں پر طوطے بول رہے ہیں۔ قرمزی شہتوت کے آویزے جھوم رہے ہیں۔ ونتی! ونتی! جاگ ونتی!''

اور پھر رات کے ایک یا ڈیڑھ بجے ہم دلوں میں محبت کی دھیمی دھیمی آگ سلگائے خاموشی سے جدا ہو جاتے۔

انہی دنوں ذہن میں ''جہاں برف گرتی ہے'' زرد زرد غمگین سا چاند طلوع ہونا شروع ہوا۔ میں نے سوچا کوہ مری آرٹسٹ بھائی کے پاس چلتے ہیں' یہ ناولٹ وہاں جا کر لکھیں گے۔ گرمیوں کا موسم تھا' لاہور شہر شدید گرمی میں خود بھی جھلس رہا تھا اور لوگوں کو بھی جھلسا رہا تھا۔ چنانچہ ایک روز گاڑی میں سوار ہوا اور کوہ مری کی طرف چل پڑا۔ مری میں موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آرٹسٹ بھائی سیروز سینما کے پچھواڑے اپنے کمرے کے فرش کو بوٹ پالش کرنے والے برش سے صاف کر رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے عاشق ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا' کہنے لگا۔

''اب یہاں مہینہ بھر ضرور رہنا' بھاگ مت جانا۔''

اس سے پہلے میں جب بھی مری گیا' دو ایک روز کے بعد وہاں سے بھاگ آتا تھا۔ میں نے کہا۔

''یار! میں تو ناولٹ لکھنے آیا ہوں' کافی دنوں رہوں گا فکر مت کرو۔''

اگلے روز صبح کو سیر سے واپس آ کر ہم نے تاج محل ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ وہ اپنے کام پر چلا گیا اور میں میز پر ناولٹ لکھنے بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کر میں نے قلم کو ہاتھ لگایا تو وہ کوہ مری کی سردی میں برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ پیڈ کے کاغذ کو چھوا تو وہ بھی ٹھنڈا تھا۔ میں نے کاغذ اٹیچی کیس میں بند کر دیا اور سینما کے اس کمرے میں آ گیا جہاں آرٹسٹ بھائی ایک بہت بڑے بورڈ پر صبیحہ کی تصویر بنا رہا تھا' میں نے کہا۔

''یار مقصود! یہاں موسم بڑا خراب ہے۔''

اس نے گھوم کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔''

چنانچہ میں اسی روز دس گیارہ بجے کی بس میں سوار ہو کر راولپنڈی اور وہاں سے ریل میں بیٹھ کر لاہور آ گیا۔

دو تین دنوں کے بعد میں نے مصری شاہ والے باورچی خانے میں بیٹھ کر ''جہاں برف گرتی ہے'' ناولٹ لکھا۔ میں پسینے میں شرابور تھا اور پہاڑوں پر گرتی برف کا منظر بیان کر رہا تھا۔

ٹی ہاؤس سے رات کو میں' اصغر سلیم' نواز اور حسن طارق عام طور پر اکٹھے ہی واپس مصری شاہ جایا کرتے۔ ہم انار کلی سے نکل کر پیدل ہی لطیفہ بازی کرتے' ہنستے' مذاق کرتے' شعر پڑھتے دلی دروازے کی طرف چل پڑتے۔ اصغر سلیم کی یہ عادت تھی کہ وہ بات کرتے ہوئے بار بار میرے کندھے کو غیر محسوس طور پر بائیں جانب دھکیلے جایا کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر فرلانگ کے بعد میں کسی نہ کسی دوکان کے پھٹے پر چڑھا ہوتا۔ میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ میں اس کی دائیں جانب چلا کروں۔

دن میں کسی وقت مجھے مصری شاہ جانا پڑتا تو میں اکثر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' میو ہسپتال اور گوالمنڈی سے ہو کر جاتا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے لان میں ملکی اور غیر ملکی گلاب کے پودے بڑے اہتمام سے لگائے گئے تھے۔ ان ہی پودوں میں ایک پودا زرد گلاب کا تھا جس کی شاخوں میں انتہائی خوبصورت اور دھیمی گہری خوشبو والے زرد گلاب' جنوری کی چمکیلی دھوپ میں مسکرایا کرتے۔ اسی طرح ایک روز میں ان زرد گلابوں کے قریب سے انہیں محبت سے دیکھتا ہوا گزر رہا تھا کہ رضیہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اداس اور گہرے خیالوں والی خواب انگیز رضیہ یہی لڑکی میری طویل کہانی ''زرد گلاب'' کی ہیروئن بنی۔

سدا مسکراتے رہو میرے زرد گلابو!

میرے زرد سورجو!

◆◆◆

رنگون کی دیوداسی

دوسری جنگ عظیم چھڑ چکی تھی۔

ابھی جاپان جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا کہ خانہ بدوش ہوائیں مجھے لے اڑیں اور میں امرتسر سے ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر کلکتہ اور کلکتے سے ایک بحری جہاز میں بیٹھ کر خلیج بنگال کے گہرے سیاہ پانیوں کو عبور کرتا رنگون پہنچ گیا۔ سنہری بدھی مندروں' جھومتے ناریلوں' کنول سے بھری ہوئی جھیلوں اور زرد کیلے کے گنجان جنگلوں کا دیس رنگون ۔۔۔۔۔۔ میں نے اسی سال میٹرک کیا تھا بلکہ میٹرک کا نتیجہ میں نے لکھنو ریلوے اسٹیشن پر سول ملٹری گزٹ اخبار ہی میں پڑھا۔ میں نے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کر لیا تھا۔ گھر والے آگے پڑھانا چاہتے تھے اور میں اس سے بھی آگے جا کر دیش دیش' جنگل جنگل کی آوارہ گردی کرنا چاہتا تھا۔ رنگون کے بارے میں میں نے میونسپل کمیٹی کی لائبریری میں بیٹھ کر بہت سی رنگین تصویریں دیکھی تھیں۔ کیلے کے سبز پتوں میں چھپے ہوئے زرد گچھے' دریائے ایراوتی کے گدلے پانیوں میں کشتیاں کھیتے ملاح' سنہری دھوپ میں چمکتے بدھی مندروں کے طلائی کلس' گوتم بدھ کی مقدس مورتیوں کے آگے ادب سے جھکے ہوئے زرد کپڑوں والے بدھی بھکشو' نیلی جھیلوں پر کھلے ہوئے کنول کے سفید پھول اور بانس کے گہرے سبز جنگلوں میں چیتے کی انگاروں ایسی دہکتی آنکھیں۔۔۔۔۔۔ رنگون' دیکھنے کی مجھے بڑی حسرت تھی چنانچہ ایک دن میں رنگون پہنچ گیا۔

رنگون شہر کی مشہور سڑک سپارک سٹریٹ میں ہمارے ایک قریبی عزیز رہتے تھے' میں ان کے ہاں جا کر ٹھہر گیا۔ اس شہر میں پنجابی' سندھی' میمن اور یوپی کے مسلمانوں کی بھاری تعداد آباد تھی۔ یہاں سے اردو کے دو مشہور اخبار ''شیر'' اور ''مجاہد برما'' شائع ہوتے تھے۔ ان اخباروں کو باری علیگ اور ممتاز ملک ایڈٹ کرتے رہتے ہیں۔ پختہ عمر کے پابند صوم وصلوٰت شاہ جی ان دونوں اخباروں کے مدیر اعلیٰ تھے۔ انہوں نے مجھے اخبار کے دفتر میں بطور اپرنٹس رکھ لیا۔ اسرائیل احمد چیف نیوز ایڈیٹر تھے۔ وہ مجھے خبروں کا ترجمہ کرنا سکھاتے۔

ممتاز ملک صاحب نے مجھے رنگون ریڈیو پر بھی پنجابی میں خبریں پڑھنے کا کام دلوایا۔ اب مجھے اتنے پیسے ملنے لگے کہ میں سینما بھی دیکھتا' ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھانا کھاتا' چائے پیتا اور شہر کی سیریں بھی کرتا۔ محمود نامی ایک سورتی میمن لڑکا میرا دوست بن گیا۔ وہ گٹار

بڑی اچھی بجاتا تھا۔ رنگون مسلم ایسوسی ایشن (کچھ اسی قسم کا نام تھا) کے ماہانہ جلسے شہر کی بہترین لائبریری کے ہال میں منعقد ہوا کرتے۔ وہاں محمود گٹار بجاتا اور میں علامہ اقبال کی نظمیں گا کر سنایا کرتا۔ موتی لعل اور خورشید کی فلم ''پردیسی'' شاید پچاسویں ہفتے میں چل رہی تھی۔ میں نے اور محمود نے اس فلم کا ایک گانا ''اب کہاں بسیرا اپنا'' خوب پکا لیا تھا۔ چنانچہ ہم ثقافتی جلسوں میں اکثر یہ گانا گایا کرتے۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں دوسری عالم گیر جنگ شروع ہو چکی تھی مگر جاپان ابھی میدان جنگ میں نہیں کودا تھا اس کے باوجود اتحادیوں کو جاپان کی طرف سے خطرے کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ چنانچہ برما کے ہر بڑے شہر میں ہوائی حملے سے بچاؤ کے لیے زمین دوز پناہ گاہیں کھودی جا رہی تھیں۔ امریکی' برطانوی' ہندوستانی سپاہیوں سے بھرے ہوئے بحری جہاز رنگون کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو رہے تھے۔ ''من جی آس'' اور ''تھابی ٹاگن'' کے تیل کے عظیم ذخیرے کو ہر لحاظ سے محفوظ کیا جا رہا تھا۔ رنگون کی منڈیوں میں اجناس کے دام آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔ رنگون سیکرٹریٹ کے گرد اگرد خاردار تار کھینچنے کے بعد ملازموں میں شناختی کارڈ تقسیم کر دیئے گئے تھے اور مسلح گارڈ کا پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ پٹرول اور گولہ بارود کی ذخیروں کو سیلز بیرکس سے نکال کر رنگون کے گرجاؤں اور کالجوں میں کیموفلاج کیا جا رہا تھا۔

رنگون ریڈیو سے اردو سروس شام کو ایک گھنٹہ کے لیے ہوتی۔ اس کے بعد پانچ منٹ کے لیے میں پنجابی میں خبریں سناتا۔ رنگون ریڈیو کی عمارت میکسٹم سٹریٹ میں تھی۔ مسٹر میکائے انچارج تھے۔ مسٹر ڈی کوسٹا ایک حلیم الطبع ادھیڑ عمر کا پرتگالی انجینئر تھا جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رنگون شہر کے مشرقی کونے پر دریائے ایراوتی کے کنارے ایک خوبصورت کاٹیج میں رہتا تھا۔ ایک روز وہ گاڑی میں بٹھلا کر مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی نے مجھے ٹھنڈی کریم ڈال کر کافی پلائی۔ ایراوتی کی تازہ مچھلی کے سینڈوچز کھلائے۔ اس کی چھوٹی لڑکی میری ہم عمر تھی۔ ہم دونوں کوٹھی کے ہرے بھرے لان میں بیڈمنٹن کھیلتے رہے۔ وہ سفید فلیٹ شوز' سفید نیکر اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور سنہری چہرہ استوائی دھوپ میں سیب کی طرح چمک رہا تھا۔ سہ پہر کی چائے ہم نے کاٹیج کے عقبی ٹیرس میں بیٹھ کر پی۔ سامنے دریائے ایراوتی کی لہروں پر برمی ماہی گیروں کے سمپان (چھوٹی کشتیاں) دور تک تیر رہے تھے۔ مسٹر ڈی کوسٹا نے فروٹ ٹن کھول کر تازہ رس بھری خوبانیاں میری پلیٹ میں ڈال دیں۔ بڑی لڑکی اناناس کاٹ رہی تھی اور چھوٹی یعنی میری ہم عمر لڑکی میرے ساتھ بیٹھی چائے میں ناریل کا دودھ ڈال رہی تھی اور فضا میں ناریل' اناناس' خوبانی سیلون کی چائے کی خوشبو میں اس لڑکی کے جسم سے اٹھتے دھیمی دھیمی مہک مخلوط ہو رہی تھی۔ میں جب گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے

رخصت ہوا تو سورج ایراوتی کی لہروں میں غروب ہو رہا تھا اور ان لوگوں کے محبت بھرے چہرے سورج کی الوداعی کرنوں میں چمک رہے تھے، جنہیں میں پھر کبھی نہ دیکھ سکا۔

برمی عورتوں کا رنگ عام طور پر سفیدی مائل زرد ہوتا ہے۔ چہرے کی جلد میں بڑی تازگی اور چمک ہوتی ہے۔ اس چمک اور تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے برمی عورتیں ایک خاص قسم کی بوٹی کا ست استعمال کرتی ہیں جسے برمی زبان میں ''تناکھا'' کہا جاتا ہے۔ ہر عورت رات کو چہرے پر تناکھا مل کر سوتی ہے اور صبح منہ دھونے کے بعد چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ ایسے تروتازہ اور چمکیلے چہرے والی ایک نازک اندام برمی لڑکی کو میں نے مسٹر ڈی کوستا کے کالج سے اپنے گھر آتے ہوئے دیکھا، وہ ایک بس سٹاپ کے بنچ پر کیلے کا زرد گچھا گود میں لیے بیٹھی تھی۔ ہماری گاڑی اس کے سامنے سے گزری تو اس نے جوں ہی گردن گھما کر میری طرف دیکھا ایک پل کے لیے ہماری آنکھیں چار ہوئیں، مجھے یوں لگا جیسے وہ مسکرا دی ہو۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ نازک اندام برمی لڑکی پیچھے رہ گئی۔ اس کی معصوم مسکراہٹ پیچھے رہ گئی۔ غروب ہوتا ہوا سورج پیچھے رہ گیا۔ دریائے ایراوتی کی لہروں پر اس کی کرنوں کا پگھلا ہوا سونا پیچھے رہ گیا۔

جس فلیٹ میں میری رہائش تھی اس کے عقب میں ایک مختصر سا باغیچہ تھا۔ میرا کمرہ اس باغیچے کے کونے پر تھا، کھڑکی کے چھجے پر موتگرہ بیل چڑھی ہوئی تھی جس کے سفید پھول رات کو میرے کمرے میں مہک پھیلا دیتے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ساتھ کیلے کے چوڑے پتوں والے درختوں کی قطار کھڑی تھی۔ صبح کو کیلے کے قرمزی پور اور سبز پتے شبنم میں نہائے ہوئے سامنے والے فلیٹ کے کمرے میں نیم سبز پروقار آنکھوں والی ایک غمگین سی دبلی عورت اپنی بچی کے ساتھ رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ گیلری میں آکر آرام کرسی پر بیٹھ جاتی اور سگریٹ سلگا کر بڑی گہری محویت سے دور پارک میں لہراتے ناریل کے درختوں کو دیکھا کرتی۔ مجھے یہ عورت بڑی اچھی لگتی تھی میں بھی اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا اسے چوری چوری دیکھا کرتا۔

ایک روز رنگون کا آسمان گہرے سرمئی بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں وائٹ ہارس کا سگریٹ سلگائے کھڑکی کے پاس کرسی پر کیلے کے چوڑے پتوں پر بارش کی بوندوں کو گرتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ سامنے والے فلیٹ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ لمبے بھورے بالوں والی نیم سبز پروقار یورپین عورت گیلری میں آکر بیٹھ گئی۔ سگریٹ اس کی مخروطی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر وہاں چپ چاپ بیٹھی گرتی بارش کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے دل کا حال جانتی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اپنی کھڑکی میں بیٹھا اسے چوری چوری دیکھا کرتا ہوں۔ میری عمر یہی کوئی سولہ سترہ برس کی تھی اور وہ عمر میں مجھ سے سولہ سترہ برس بڑی تھی۔

اب بارش کا زور کم ہو چکا تھا اور اس نے ہلکی بوندا باندی کی شکل اختیار کر لی تھی اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا جیسے وہ مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں فوراً اٹھا اور بارش میں ہی اپنے فلیٹ کے گراؤنڈ فلور کے عقبی دروازے سے نکل کر اس کے فلیٹ میں جا پہنچا۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس نے چشمہ اتار رکھا تھا۔ اس کی نیم سبز آنکھوں میں گہری جھیلوں ایسا سکون اور وقار تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میرا ہاتھ بارش میں ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بارش میں گرم ہو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اس کی چھوٹی سی بچی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ بچی کی آنکھیں نیلی، بال سنہری اور گھنگھریالے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے بھی مسکرا کر اس کے سر پر پیار کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس عورت نے میرے سر پر ہاتھ سے پیار کیا۔ میں نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے نرم میٹھے اور پرسکون لہجے میں بولی۔

''یو گڈ بوائے۔۔۔۔۔۔''

اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے کچھ باتیں کیں جو مجھے یاد نہیں رہیں۔ میں نے بھی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے کچھ باتیں کیں جو مجھے یاد نہیں۔ رنگون کے بارے میں نے صرف ایک ہی طویل مختصر افسانہ لکھا، اس افسانے میں اس نیم سبز آنکھوں والی پراسرار عورت کو میں نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ میں اپنے اس افسانے کو بھول گیا ہوں لیکن نیم سبز آنکھوں، بھورے اور شفقت بھرے چہرے والی عورت کو نہیں بھولا۔ اور کبھی نہیں بھولوں گا۔

رنگون میں کئی ایک بدھی مندر تھے۔ لیکن سولی پیگوڈا رنگون کا سب سے بڑا بدھی مندر تھا۔ یہ مندر ایک بہت بڑے چوک کے وسط میں واقع ہے۔ اس کی پتھریلی سیڑھیاں کئی منزلوں تک زمین سے اوپر اٹھتی چلی گئی ہیں۔ ہر منزل پر جب سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں تو ایک چبوترہ آ جاتا ہے جہاں برمی لڑکیاں آمنے سامنے بیٹھی پھول بیچتی ہیں۔ تیسری منزل پر پہنچ کر مندر کا صحن آ جاتا ہے۔ صحن سنگ سرخ کا ہے۔ سامنے برآمدے ہیں۔ یہاں سے آگے جا کر ہال کمرے آتے ہیں جہاں جگہ جگہ مہاتما بدھ کے سونے کے مجسمے رکھے ہیں۔ ایک بڑے ہال کمرے میں مہاتما بدھ کا بہت بڑا مجسمہ ہے۔ غالباً وہ سونے کا نہیں اس پر سونے کا پانی پھیرا گیا ہے۔ اس مجسمے کے اردگرد بخورات کا دھواں پھیلا رہتا ہے اور مجسمے کے قدموں میں پھولوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

میں دن بھر رنگون کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا۔ ایک روز گھومتے گھومتے پیگوڈا کی طرف آ نکلا۔ گوتم بدھ سے مجھے شروع ہی سے بڑی عقیدت رہی ہے، اب جو سامنے گوتم بدھ کا ایک عظیم الشان مندر دیکھا تو قدم بے اختیار اس کی سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئے۔

سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے میں جب دوسری منزل کے چبوترے پر پہنچا تو میں نے پھول بیچنے والی ایک لڑکی کو دیکھا۔ وہ دوسری پھول بیچنے والی عورتوں کے ساتھ لکڑی کی چوکی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے پانی سے بھری ہوئی بالٹیوں میں سفید قرمزی اور نیم کاسنی کنول کے پھول مسکرا رہے تھے۔ اس لڑکی کا چہرہ کنول کے پھول سے بڑھ کر شگفتہ اور معصوم تھا۔ یہ لڑکی مجھے بہت پیاری لگی۔ میں اس کے پاس گیا۔ وہ مسکرائی اور اس نے کنول کا ایک گچھا کیلے کے پتے میں لپیٹ کر مجھے تھما دیا اور بولی۔

''فور سینٹ سر''

میں نے چار سینٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ وہ پھر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ کی جھیل میں لاکھوں سورج چمک رہے تھے۔ لاکھوں کنول کھلے ہوئے تھے۔ میں اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کی زبان برمی تھی۔ میری زبان پنجابی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ نہ پنجابی تھی اور نہ برمی۔

مسکراہٹ کا کوئی رسم الخط' کوئی تحریر' کوئی تلفظ نہیں' وہ صرف مسکرا رہی تھی۔ اور میں سمجھ رہا تھا۔ رسم الخط' تحریر اور تلفظ کے پردے اٹھ گئے تھے۔ میں پھول ہاتھوں میں تھامے اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مندر میں جا کر میں نے پھول گوتم بدھ کے ایک سنہری مجسمے کے قدموں میں ڈال دیئے اور گوتم بدھ کے پرسکون چہرے کو مسکرا کر دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے گوتم بدھ بھی ذرا سا مسکرایا ہو۔ اس کی مسکراہٹ اور پھول بیچنے والی برمی لڑکی کی مسکراہٹ میں صرف اتنا ہی فرق تھا کہ وہ مندر کے باہر بیٹھی تھی اور گوتم بدھ مندر کے اندر بیٹھا تھا۔ بعد میں جب میں نے رنگون کے بارے میں اپنا ناول ''جھیل اور کنول'' لکھا تو پھول بیچنے والی لڑکی اس کی ہیروئن بنی۔ میں نے اس کا برمی نام ''ساتمیں'' رکھا۔ ناول میں اس لڑکی نے مجھ سے محبت کی۔ میں نے اس لڑکی سے محبت کی۔ میں نے اس کے گھر کا نقشہ کھینچا۔ اس کی خالہ کے گھر میں چھپ چھپ کے ملاقاتیں کیں اور جب رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو رنگون سے ہجرت کر کے اکیاب شہر کے مضافاتی جنگلوں میں اس لڑکی سے ڈرامائی ملاقات کی۔ ہم دونوں جاپانیوں کے قیدی بنے۔ ایک رات جیل سے فرار ہوئے۔ ساحل سمندر پر یہ لڑکی جاپانی چہرہ داروں کی گولی کا شکار ہو کر مر گئی۔ میں نے اس کی مردہ پیشانی کو چوما اور چاندنی رات میں سمندری لہروں پر جھولتی کشتی میں سوار ہو کر روم کی طرف فرار ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس پھول بیچنے والی لڑکی کو بدھی مندر کی سیڑھیوں پر پھول بیچتے دیکھا۔ اس سے چار سینٹ میں پھول خریدے وہ مسکرائی اور بس!

خدا جانے وہ لڑکی آج کہاں ہو گی۔ یقیناً اس کی شادی ہو گئی ہو گی۔ اس کے بچے جوان ہو گئے ہوں گے۔ میں اسے ہرگز یاد نہیں رہا ہوں گا۔ بھلا وہ ایک ایسے لڑکے کو کیسے یاد رکھ سکتی ہے جس نے آج سے پچیس چھبیس برس پہلے مندر کی سیڑھیوں پر اس سے چار

سینٹ میں کنول کے پھول خریدے ہوں۔ اور۔۔۔۔۔۔ اور اگر وہ مر گئی ہے تو میرا خدا اور اس کا بھگوان بدھا اسے میری جنت اور اس کے سورگ میں سفید کنول سے بھری ہوئی جھیلوں کے کنارے بانس کے گہرے' پراسرار ٹھنڈے سایوں والے جنگلوں میں سدا سکھی رکھے۔ میں نے کئی خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوشبودار چائے پی ہے اور میں انہیں بھول گیا ہوں' ذہن میں چائے کی خوشبو باقی ہے۔ لڑکیوں کے چہرے غائب ہو گئے۔ لیکن اس برمی لڑکی کی مسکراہٹ' معصوم مسکراہٹ اور اس کا بھولا بھالا پرسکون' شگفتہ' تروتازہ' حیادار بے لوث چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ ہر صبح مشرق میں سورج کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں اس کے ساتھ غروب ہو جاتا ہے۔ میں اپنے مکان کے صحن میں لگے ہوئے زرد گلاب کی پنکھڑیوں میں اس کی صورت دیکھتا ہوں اور موتیے کی سفید کلیوں میں اس کی آواز کی خوشبو سونگھتا ہوں۔ دسمبر کی ٹھٹھرتی راتوں کی شبنمی خاموشی میں' اس کی آواز سنتا ہوں اور دن چڑھے شہر کے شور وغل میں اس کی مقدس خاموشی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہوں۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ میں نے بھی خاموشی کو دیکھا ہے' راتوں کے روپ میں' برمی لڑکی کے روپ میں' گوتم بدھ کے روپ میں۔۔۔۔۔۔ نہایت اعلیٰ چائے پی کر' نہایت اعلیٰ سگریٹ سلگا کر' جب کبھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو ایک جنگل کو دیکھتا ہوں۔ اوس ٹپکاتے گھنے تاریک گہرے جنگل کو۔۔۔۔۔۔ اور پھر تاریک گہری خاموش اور روشن رات کے نور میں ایک چہرہ ابھرتا ہے' جو مراقبے میں ہے اور جس کی پیشانی پر کبھی طلوع نہ ہونے والے' کبھی غروب نہ ہونے والے سورج کی روشنی ہے۔ روشنی کی سرگوشی ہے۔۔۔۔۔۔ دھیمی' پراسرار' پرسکون خاموشی!

◆◆◆

اداس لڑکی

پاک ٹی ہاؤس کی پرجوش محفلیں اپنے عروج پر تھیں۔

''نقوش'' کا ناولٹ نمبر نیا نیا شائع ہوا تھا جس میں منٹو صاحب کا ناولٹ ''پیاری'' اشفاق احمد کا ''مہمان بہار'' اور میرا ''جہاں برف گرتی ہے'' بھی شامل تھا۔ ٹی ہاؤس میں گرم خوشبودار چائے کے دور چلتے اور ''نقوش'' کے ناولٹ نمبر پر خوب بحثیں ہوتیں۔ اشفاق احمد ایک نئے افسانہ نگار کی حیثیت سے آسمان ادب پر روشن ستارہ بن کر ابھر رہا تھا۔ اس کے شروع شروع کے افسانے پڑھ کر میں اس کا مداح بن گیا۔ دو چار سطروں میں ہی کچھ ایسی مہارت اور چابکدستی سے قلم چلاتا کہ کردار اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ پورے کا پورا نمودار ہو کر سامنے آ جاتا۔ منظر نگاری اور ماحول کی عکاسی میں اشفاق احمد بڑا حقیقت پسند ہے۔ خواہ مخواہ کی رومان نگاری اور الفاظ کا ضیاع اس کے افسانوں میں کہیں نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی دل میں اتر جانے والی طنز کرتا ہے۔ اس کا مزاح خاص پنجاب اور دوآبے کا ہے۔ کردار نگاری میں تو اشفاق احمد گوگول اور گورکی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے بعد کردار نگاروں کی یہ عظمت میرے ذاتی خیال میں سوائے اشفاق احمد کے اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ منٹو صاحب اشفاق احمد کو مجھ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ ''نقوش'' کے لیے باغ جناح میں ہمارا ایک گروپ فوٹو لیا جانے لگا تو منٹو صاحب نے اشفاق احمد کو خاص طور پر اپنے پاس کھڑا کیا تھا اور مجھے اس پر بڑا رشک آیا تھا۔ ''مہمان بہار'' ''بابا اور گڈریا'' اردو ادب کے ہمیشہ زندہ رہنے والے افسانے ہیں۔ کاش میں بھی ''گڈریا'' ایسا کوئی افسانہ لکھ سکتا۔

اشفاق احمد سے بہت جلد میری دوستی ہو گئی اور ہم ایک دوسرے کے پکے یار بن گئے۔ ٹی ہاؤس میں اکٹھے بیٹھ کر چائے پیتے' گھل مل کر باتیں کرتے' لطیفے سناتے اور خوب قہقہے لگاتے اور رات کو جب اپنے اپنے گھر جاتے تو افسانہ لکھنا شروع کر دیتے۔ ان دنوں اشفاق نمبر ایک مزنگ روڈ پر رہتا تھا۔ اس کا کمرہ سب سے اوپر والی منزل پر تھا۔ وہ آئل کلر تصویریں بھی بناتا تھا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں وہ کمرہ دہک رہا ہوتا اور سردیوں میں ٹھنڈا برف ہو جاتا۔ ابن انشاء ان ہی دنوں اپنی رومانوی نظم ''بغداد کی ایک رات'' لکھ رہا تھا۔ خدا جانے کس وقت اور کہاں بیٹھ کر لکھتا۔ بہر حال ٹی ہاؤس میں ہمیں ہر روز اس کے تازہ بند سناتا اور ہم بغداد کی الف لیلوی فضاؤں میں گم ہو جاتے۔ ابن انشاء نشاط سینما کے سامنے والی چینی پیگوڈا نما مکان میں رہتا تھا۔ میں' ابراہیم جلیس' ساحر

لدھیانوی اور ظہیر کاشمیری وغیرہ جب اس کے کمرے میں داخل ہوتے تو ابن انشاء کو مجبور کرتے کہ وہ جی کھول کر ہماری خاطر مدارت کرے وہ ہمیں چائے پر ٹرخانے کی کوشش کرتا مگر اکثر ہم اس کے ہاں سے کھانا کھا کر ہی نکلتے۔ ابن انشاء کے والد صاحب ہمیں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے۔ پرانی وضع کے سیدھے سادے اور مخلص اور مشفق بزرگ تھے۔ مکان کے سامنے پیپل کے پیڑ تلے چارپائی پر اور کبھی آرام کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے ہوتے۔ ہم سلام کرتے تو بہت محبت سے مسکرا کر ہمیں دعا دیتے۔ ابن انشاء ہمیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر پہلے ہنستا اور پھر رونے لگتا۔ پوچھنے پر بتاتا۔

''کمینو! میں ہنسا اس لیے ہوں کہ تم آ گئے ہو اور رویا اس لیے ہوں کہ اب تم کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گے۔''

ویسے یہ ابن انشاء کے مزاج کا خاص انداز تھا ورنہ دوستوں کی خاطر مدارات سے اسے دلی خوشی ہوتی۔ ہم تو اسے جان بوجھ کر تنگ کرتے تھے۔ جن دنوں ہم ''امروز'' میں باقاعدگی کے ساتھ لکھا کرتے تھے اور ہمیں سات روپے فی کالم معاوضہ ملتا تھا۔ ایک روز میں اور ابن انشاء بیڈن روڈ سے گزر رہے تھے۔ بائیں جانب جوتوں کی ایک دکان آئی۔ ہم دونوں شوکیس میں لگے ہوئے جوتے دیکھنے لگے۔ ایک جوتے پر اکیس روپے کی چٹ لگی تھی۔ ابن انشاء بولا۔

''یہ جوتا امروز کے تین کالموں میں آئے گا۔''

اسی وقت ہم دونوں لاہور کی قدیم پر پیچ و نیم تاریک تاریخی گلیوں کی سیر کو نکل جاتے اور دن بھر ان پراسرار گلیوں میں گھومتے رہتے۔ کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ کسی گلی کی نکڑ پر سجی سجائی اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کی تصویر والی دکان سے پان لے کر کھاتے۔ پان کھانے کے معاملے میں ابن انشاء بڑا پر ذوق ہے۔ ہمیشہ ہر قسم کی خوشبو ڈلوا کر پان کھاتا اور پھر جتنی دیر میرے ساتھ رہتا مجھے طرح طرح کی خوشبوئیں آتی رہتیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں کسی دیہاتی دولہا کے ساتھ جا رہا ہوں۔ ایک روز ٹی ہاؤس میں ہماری محفل سجی تھی کہ کاؤنٹر پر حلیم صاحب نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔

''تمہارا ٹیلیفون ہے۔''

وہ مسکرا رہے تھے۔

''ہیلو۔۔۔۔۔۔۔جی ہاں' میں بول رہا ہوں۔''

یہ کسی لڑکی کا فون تھا' میرا ناولٹ ''جہاں برف گرتی ہے'' اسے بہت پسند آیا تھا اور وہ مجھے ملنا چاہتی تھی۔ میں اگر یہ کہوں کہ ان دنوں مجھے لڑکیوں کے بہت فون آیا کرتے تھے تو یہ کوئی اپنی شان دکھانے والی بات نہیں ہے۔ میرے افسانے اور ناول لڑکیوں میں

بہت مقبول تھے۔ چنانچہ وہ مجھے اکثر ٹی ہاؤس ملنے آتیں اور ان کے فون بھی آ جاتے نہ تو میں کسی کی محبت میں گرفتار تھا اور نہ وہ مجھ سے اظہار عشق کرتیں بس لکھنے اور پڑھنے والے کا ناطہ تھا۔

میں نے فون پر ہی اس لڑکی سے کہا کہ وہ اگر مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو کسی وقت دن میں ٹی ہاؤس میں آ جائے' مل لوں گا۔ اس نے کہا میں ہوٹل میں نہیں ملوں گی۔ میں نے کہا' یہ ہوٹل نہیں ہے یہ تو ایک ادبی مرکز ہے جہاں اتفاق سے چائے بھی ملتی ہے۔ مگر وہ نہ مانی۔ میں نے کہا۔

''تو پھر ٹی ہاؤس کے بعد باغ جناح ہی ایک جگہ ہے۔''

''ٹھیک ہے میں لارنس باغ آ جاؤں گی۔''

''کل نو بجے صبح میں لارنس روڈ نرسری والے گیٹ پر انتظار کروں گا۔''

''میں نے تو ''سویرا'' اور ''نقوش'' میں آپ کی تصویر دیکھی ہے' آپ مجھے کیسے پہچانیں گے؟''

''کوئی نشانی بتا دیں۔''

''میرا برقعہ نسواری رنگ کا ہوگا اور ۔۔۔۔۔۔ ہاں' میرے بائیں ہاتھ میں سرخ ریشمی رومال ہوگا۔''

باغ جناح میں دسمبر کی چمکیلی دھوپ پھولوں بھرے قطعے' پرشکوہ درخت' نسواری برقع اور گورے ہاتھ میں سرخ ریشمی رومال ۔۔۔۔۔۔ میں رومانٹک ہو گیا۔

اگلے روز میں گرے ورسٹڈ کی پتلون اور اطالوی بوسکی کی خوبصورت قمیص پہن کر باغ جناح کے نرسری والے دروازے کے قریب سنبل کے شاندار درختوں کے پاس جا پہنچا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں ذرا پرے ہٹ کر دھوپ میں گھاس پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی کے انتظار سے بڑھ کر خوبصورت اور تکلیف دہ شے شاید اور کوئی نہیں۔ اتنے میں ایک تانگہ گیٹ کے باہر آ کر رکا۔ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک نسواری برقعے والی لڑکی بیٹھی تھی۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا اس کے بائیں ہاتھ میں سرخ ریشمی رومال تھا۔ میں اس کی طرف اور وہ میری طرف بڑھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ہم باغ جناح کے اوپن ائیر کیفے میں آ کر سبز پردوں والی کیبن میں بیٹھ گئے۔ چائے پر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں اور کچھ نروس ہو رہی تھی۔ اس نے چائے بنا کر پیالی میری طرف کی تو چائے چھلک کر میری پتلون پر گر گئی۔

''اوہ ۔۔۔۔۔۔!'' اس نے اپنا سرخ رومال پیش کیا۔

اب اس نے نقاب الٹ دیا تھا' اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک کی بجائے دلگیری اداسی تھی' وہ آرٹسٹ تھی اور تصویریں بناتی تھی۔ اس کے ریشمی لباس سے فارول سینٹ کی خوشبو آ رہی تھی' وہ گالز وردی اور گیٹس کی دیوانی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے ''جہاں برف گرتی ہے'' ناولٹ گالز وردی کے ''سیب کے درخت'' سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

''یہ آپ نے کہاں بیٹھ کر لکھا تھا؟''

جب میں نے اسے بتایا کہ یہ ناولٹ میں نے مصری شاہ کی عزیز روڈ والے مکان کے باورچی خانے میں بیٹھ کر لکھا ہے اور وہاں کوئی پنکھا بھی نہیں تھا اور جب میں برف باری کے مناظر لکھ رہا تھا تو میرے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا تو اسے بالکل یقین نہ آیا۔

''کیسے ہو سکتا ہے؟''

''جیسے بھی ہو سکتا تھا' ہو گیا۔''

اب یہ لڑکی مجھے بور کرنے لگی۔ میں نے بل منگوایا اور اس کے ساتھ باغ جناح سے باہر آ گیا۔ چڑیا گھر والے گیٹ سے تانگے میں بیٹھ کر ہم مال روڈ پر چل پڑے۔ ان دنوں ٹیکسیاں رکشے نہیں ہوتے تھے۔ وائی ایم سی ہال کے سامنے تانگے سے اتر کر ٹی ہاؤس میں آ گیا وہ لڑکی چوبرجی کے علاقے کی جانب چلی گئی۔

وہ چوبرجی کی عقبی آبادی میں رہتی تھی۔ اس نے دو روز بعد مجھے پھر فون کیا اور اپنے گھر بلایا۔ ایک دو منزلہ مکان کے اوپر والی منزل میں رہتی تھی۔ نیچے اس کے رشتہ دار تھے اور اوپر وہ بالکل اکیلی اپنے سجے سجائے کمرے میں رہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا دیواروں پر آئل کلر تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ایزل پر ایک نامکمل کینوس دھرا تھا۔ یہ ایک لینڈ سکیپ تھی۔ بڑی معمولی اور بے معنی قسم کی لینڈ سکیپ۔ اس لڑکی کی آئل پینٹنگز دیکھ کر میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ وہ محض ایک غمزدہ لڑکی ہے۔ ذہین اور لٹریری نہیں ہے گالز وردی اور گیٹس اس نے اتفاق سے پڑھ لیے تھے۔ وہ کچھ دیر اٹلی فرانس کے تصویری ورثے پر سطحی سی باتیں کرتی رہی۔ میں نے واٹر کلر کی بات کی اور کانسٹیبل کا ذکر کیا تو وہ مجھے ایک الماری کھول کر اپنی خریدی ہوئی ساڑھیاں دکھانے لگی۔

اس واقعے کے چھ سات برس بعد میں نے اسے انار کلی میں اپنے خاوند اور ایک بڑی پیاری ننھی منی سی پھول ایسی بچی کے ساتھ دیکھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے نہیں دیکھا۔ لیکن اس نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ اپنے خاوند اور پیاری بچی سے میرا تعارف کروایا۔ مجھے اس کے خاوند سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس کا خاوند لوہے کا بزنس کرتا تھا اور وہ گالز وردی اور گیٹس کو بھول چکی تھی لیکن اس

روز پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر حقیقی زندگی کا سکون' آنکھوں میں سچی خوشی کی چمک اور گفتگو میں بھرپور اعتماد کا اظہار پایا۔ اس کی معصوم بچی میں مجھے وہ تمام رنگ اور خطوط نظر آئے جنہیں وہ آج تک کینوس پر منتقل کرنے کی بے کار کوشش کرتی رہی تھی۔ اس بچی سے بڑھ کر خوبصورت عظیم اور مکمل تصویر وہ آج تک نہ بنا سکی تھی اور اگر شادی نہ کرتی تو یہ تصویر کبھی مکمل نہ ہوتی۔

◆◆◆

چنار انتظار نہیں کرتے

شاہراہ قائداعظم پر جوان دنوں مال روڈ تھی۔ ہائیکورٹ کے برابر ایک کشادہ اونچی لمبی بلڈنگ کی دوسری منزل میں ''نظام'' ویکلی کا دفتر تھا۔ ہمارا اڈا اب مستقل طور پر پاک ٹی ہاؤس تھا اور صبح سے شام تک میں انور جلال شمزہ' نواز' حسن طارق' اختر عکسی' بڈی' سلوٗ حبیب' ابراہیم جلیس اور ابن انشاء وغیرہ مال روڈ پر ٹکڑیوں کی شکل میں مٹرگشت کیا کرتے۔ شیزان کی سیڑھیوں پر اور ریگل سینما کے باہر پھول بیچنے والوں نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا۔ بہار کے موسم میں یہ لوگ پانی سے بھری ہوئی بالٹیوں میں گلاب اور سوویٹ پیز کے رنگ برنگ گلدستے ڈالے موتئے کے پھولوں کے گجرے بنایا کرتے۔ میں' نواز' انور جلال اور اختر عکسی ان کے پاس کھڑے ہو جاتے اور پھول خریدنے کے بجائے ان سے یہ پوچھا کرتے کہ یہ پھول کیوں بیچتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھول بیچنے کے لیے تو نہیں ہوتے۔ شیزان ریسٹورنٹ کو کھلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے ہال میں کانسی کے گلدانوں میں یوکلپٹس کی لمبی لمبی ٹہنیاں لہرایا کرتیں۔ فضا بڑی پرسکون تھی۔ زیادہ گاہک نہیں آتے تھے یا یوں کہئے کہ صرف وہی لوگ آتے تھے جو اچھے ماحول میں اچھی چائے پینا چاہتے تھے جو صرف چائے کے شوقین تھے۔ سیاست' منافقت' دنیاداری' ریاکاری سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ خاموش دھیمی دھیمی مہک والے ماحول میں صاف ستھری میزوں پر چیکوسلواکیہ کے چینی برتن چمک رہے تھے۔ کہیں کہیں دو چار خوش پوش' خاموش مزاج' خوش ذوق گاہک ادھر ادھر بیٹھے چائے پی رہے ہوتے۔ پیالیوں میں سنہری چائے انڈیلتے ہی میز کے اردگرد کی فضا میں چائے کی خوشبو یوکلپٹس کی مہک اور کریون اے کے سگریٹ کی فلیور بس جاتی۔ میں محبت کرنے والی لڑکیوں کو محبت بھرے خطوط عام طور پر یہیں بیٹھ کر لکھا کرتا۔ فیروز سنز سے کراکسلے کا کریم کلر پیڈ خرید کر اسے فارول کی خوشبو میں بساتا اور رنج پیکو کی گولڈن چائے کا ایک گھونٹ پیتا اور یوکلپٹس کی ٹہنیوں والے گلدان کے پاس بیٹھ کر ناریل اور اناس کی مہک میں ڈوبے ہوئے محبت نامے لکھتا۔ خط لکھ کر جب میں اسے پڑھتا تو مجھے ہر سطر کی شاخ پر پھول کھلے ہوئے نظر آتے۔ کہیں زرد' کہیں سرخ' کہیں پنک اور کہیں سفید۔ میں پھولوں درختوں' جنوب مشرقی جزیروں' پہاڑوں' میدانوں' چشموں' سیلون کی اداس زرد لڑکیوں' گھنے درختوں میں اوس ٹپکاتے جنگلوں اور ایراوتی کی لہروں پر کشتی کھیتے ماہی گیروں اور ناریل کے درختوں کو چوم کر گزر جانے والی ملایا کی ہواؤں کا پاگل تھا۔ خط لکھتے ہوئے میں یہ بھول جاتا کہ میری مخاطب کوئی لڑکی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگتا میں یوکلپٹس کے کسی درخت' آلوچے کے پھول اور

زرد گلاب کی کلی کو محبت بھرا خط لکھ رہا ہوں۔

پھر مال کی ہلکی ہلکی بارش شروع ہو جاتی اور فٹ پاتھ کے درختوں کے پتے دھل کر چمکنے لگتے اور کانسی کے گلدانوں میں یوکلپٹس کی ٹہنیاں بارش کی آواز پر ہمہ تن گوش ہو جاتیں اور میری طرف دیکھ کر پوچھتیں۔

''کیا ہمیں بارش میں باہر نہ لے جاؤ گے؟ دیکھو باہر کتنی خوبصورت بارش ہو رہی ہے۔ تم نے ہمیں درختوں سے توڑ کر کانسی کے گلدانوں میں قید کر دیا ہے۔ ہمارے پتے بارش کے بغیر سوکھ جائیں گے' ہم مرجھا جائیں گے' ہمیں بارش میں لے چلو' ہمیں بارش میں لے چلو۔''

''نظام'' ویکلی کی ادارت میرے کندھوں پر آ پڑی یا کم سے کم مجھ سے یہی کہا گیا کہ اس ہفتہ وار اخبار کی ادارت میرے کندھوں پر آن پڑی ہے۔ ''نظام'' اخبار کا نام مجھے پسند نہیں تھا۔ اس کے مالکان چوہدری برادران تھے۔ انہیں ادبی رسالہ نکالنے کا بڑا شوق تھا۔ بلڈنگ کی دوسری منزل ایک جہازی طرز کا دفتر تھا۔ چھوٹے چوہدری صاحب ایک میز پر ٹیلی فون سامنے رکھے دن بھر کام کرتے رہتے اور بہت کم بولتے' میرا کوئی فون آتا تو بڑی بیزاری سے میری طرف دیکھ کر کہتے۔

''پھر آیا ہے آپ کا فون۔۔۔۔۔۔''

فون عام طور پر لڑکیوں کے ہوتے۔ اس اعتبار سے چھوٹے چوہدری صاحب کی بے زاری بے جا نہ تھی۔ میرے دوست احباب اکثر دفتر میں آیا کرتے اور وہیں گپ بازی ہوتی اور چائے کے دور چلتے۔ اس دور کے دوستوں میں احمد شجاع پاشا کی خوبصورت یادیں آج بھی میرے ذہن میں موجود ہیں۔ جالندھر کا یہ خوبصورت اور وجیہہ نوجوان ان دنوں بڑی گرم جوشی اور جذبے کے ساتھ ناول لکھا کرتا تھا۔ روسی اور فرانسیسی ادب پر گھنٹوں بے تکان بولتا۔ دو چار کتابیں ہمیشہ اس کی بغل میں ہوتیں۔ گرے پتلون اور ڈارک کا ڈرائے کے کوٹ میں ملبوس پائپ منہ میں لگائے وہ میرے دفتر میں مسکراتا ہوا داخل ہوتا۔ کرسی پر بیٹھ کر کتابیں میز پر رکھ دیتا اور پائپ کی کش لگاتے ہوئے بڑی محبت اور خلوص سے باتیں شروع کر دیتا۔ اس کے انداز میں بڑی شائستگی' دھیما پن اور گرمائش تھی۔ اسے بھی میری طرح بہترین چائے اور اعلیٰ قسم کے تمباکو کا شوق تھا۔ آج بھی جب کبھی میں کسی جگہ بہترین چائے پینے کے بعد اعلیٰ نسل کا سگریٹ سلگاتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے احمد شجاع پاشا کا مسکراتا ہوا چہرہ آ جاتا ہے۔ ''نقوش'' کے ایڈیٹر نے ناولٹ نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا اور مجھے بھی ناولٹ لکھنے کی دعوت دی۔ ایک روز میں نے کراکسلے کے کریم کلر پیڈ اور گولڈ فلیک کا کارٹن خریدا اور ناولٹ لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک بار لکھ کر اسے دوسری بار پھر لکھا۔ ابھی میں نے اس کا عنوان تجویز نہیں کیا تھا۔ ناولٹ کا موضوع

ایبٹ آباد کی وادیوں میں ایک سادہ لوح چرواہن کی معصوم محبت تھی۔ ذہن میں ناولٹ کے لیے کئی عنوان آئے مگر دل کو نہ لگے۔ ایک روز میں ''نظام'' ویکلی کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان اپنا افسانہ پرچے میں چھپوانے کے لیے لایا۔ میں نے افسانہ لکھ کر رکھ لیا اور اسے کہا کہ اگلے روز آ کر معلوم کر جائے۔ تھوڑی دیر بعد ذرا فراغت ہوئی تو میں نے دراز میں سے افسانہ نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ افسانہ خطوط کی شکل میں تھا۔ ایک لڑکی نے کوہ مری سے کسی کالج میں بیٹھ کر شہر میں اپنے بیوفا محبوب کو خط لکھے تھے۔ افسانہ اچھا تھا مگر اس کا عنوان بڑا واہیات تھا۔ میں نے ایک پل کے لیے سوچا اور اسے کاٹ کر نیا عنوان ''جہاں برف گرتی ہے'' لکھ کر مسودہ خوش نویس کو دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک خیال آیا کہ یہ عنوان تو میرے ناولٹ کے لیے انتہائی موزوں رہے گا۔ فوراً کاتب سے افسانے کا مسودہ واپس لے لیا۔ ''جہاں برف گرتی ہے'' لکھا ہوا عنوان اس طرح مٹایا کہ دوبارہ نہ پڑھا جا سکے۔

''جہاں برف گرتی ہے'' نقوش کے ناولٹ نمبر میں شائع ہو گیا۔ کوئی ایک ہفتہ بعد دفتر میں کسی صاحب نے مجھے فون کیا اور کہا کہ وہ مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ اگلے روز وہ دفتر آ گئے۔ عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی آنکھوں میں خواب آلود چمک تھی۔ بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر ذرا سا مسکرائے اور کہا۔

''یہ ناولٹ آپ ہی نے لکھا ہے کیا؟''

میں خاموش رہا۔

''آپ تو لڑکے سے ہیں۔۔۔۔۔۔ خدا کی دین ہے۔''

ہم شیزان کی گیلری کے خاموش کونے میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے چائے بنائی اور پھر تھیلے میں سے ناولٹ نمبر نکال کر بولے۔

''معاف کیجئے گا' میری خواہش تھی کہ میں آپ کو آپ کے ناولٹ میں سے اپنی پسند کی چند سطریں پڑھ کر سناؤں۔''

اس کے بعد انہوں نے ناولٹ اس مقام سے پڑھنا شروع کر دیا جہاں ہیرو وادی کی چرواہن لاج کو اپنی محبت کا یقین دلاتا تھا۔

۔۔۔۔۔۔ لاج سورج مکھی کے پھول کی طرح فیصل کو تک رہی تھی اور اس کی نیم وا ہونٹ شدت محبت سے کپکپا رہے تھے۔

فیصل نے لاج کو اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

''نہیں لاج' ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ محبت بہار کی طرح لوٹ کر نہیں آتی۔ یہ بہار زندگی میں صرف ایک بار دروازے پر دستک دے کر وادیوں کی دھند میں کھو جاتی ہے اور پھر کبھی پلٹ کر نہیں آتی۔ پھول ایک بار کھلتا ہے۔ یہ سورج ایک بار طلوع ہوتا ہے۔ آؤ ہم ان پھولوں اور سورج کی کرنوں کو خزاں کے بے رنگ دنوں کے لیے اکٹھا کر رکھیں۔''

''پردیسی! میرا دل دھڑک رہا ہے۔ تم میرے ساتھ رہنا۔ تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جاؤ گے؟''

اس کے بعد ان صاحب نے ناولٹ کا وہ حصہ نکالا جہاں معصوم چرواہن گرتی برف کے طوفان میں موت کی وادیوں میں اتر جاتی ہے اور برف پوش درختوں کی سرد ٹہنیاں اسے الوداع کہتی ہیں۔

۔۔۔۔۔۔تم اب واپس نہ آؤ گی لاجی؟ ہم بہار میں اپنی ٹہنیوں پر سرخ پھولوں کے چراغ جلائے تمہاری راہ دیکھیں گے۔ تمہارا انتظار کریں گے۔ لاجی! بہار میں واپس آ جانا۔ تم نہ ہو گی تو ہماری ٹہنیوں کے سارے پھول' سارے چراغ ایک ایک کر کے بجھ جائیں گے۔ لاجی! سرخ کلیوں والے چنار کے درختوں کو بھول نہ جانا۔ پہاڑوں کی بیٹی! برف کی شہزادی۔۔۔۔۔۔!''

وہ صاحب خاموش ہو گئے انہوں نے بجھے ہوئے پائپ کا تمبا کو انگوٹھے سے دبایا' اسے سلگایا' جلتی ہوئی دیا سلائی پیالی میں بجھائی اور میری طرف دیکھ کر بولے۔

''برخوردار! یہاں سے بھاگ جاؤ' ایک وقت آئے گا کہ تمہارے درختوں کے سارے پھول' سارے چراغ بجھا دیے جائیں گے۔''

وہ صاحب مال روڈ پر مجھ سے ہاتھ ملا کر لارنس باغ کی طرف چل دیے۔ انہیں میں نے پھر کبھی نہ دیکھا۔

◆◆◆

پرانا محبت نامہ

محبت بھرے خط زندگی کی حسین یادگاریں ہوتی ہیں۔ شگفتہ تمناؤں سے دھڑکتے' پراسرار سرگوشیوں والے' خوشبوؤں میں بسے ہوئے خط' کبھی یہ عود و عنبر کی مانند سلگ سلگ کر محبت کے ایوانوں کو مہکایا کرتے تھے اور اب ان کی راکھ سوکھی پنکھڑیوں کی ٹھنڈی چتا پر بکھری پڑی ہے۔ محبت کرنے والے چلے گئے۔ محبتیں باقی رہ گئیں۔ پھولوں کی خوشبو اڑ گئی۔ پنکھڑیاں مرجھا گئیں۔ جن درختوں کے ہرے بھرے جھنڈوں میں بلبلیں چہچہایا کرتی تھیں۔ اب ان کے سوکھے پتوں کو خزاں کی ہوائیں اجڑے باغ کی روشوں پر اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ ایک محبت بھرا خط بادل نے بارش کے شفاف قطرے پر لکھ کر سمندر کو بھیجا اور وہ موتی بن کر اس کی بے کراں لہروں میں کھو گیا۔ سفر نصیب بادل کو وہ موتی کبھی واپس ملے گا؟

درخت نے اپنی شاخ کے پتے پر زمین کے نام محبت بھرا خط لکھا۔ پت جھڑ میں وہ پتا شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گرا اور ہوا اسے اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔ کیا یہ مل کر بچھڑ جانے والے کبھی پھر بھی ملیں گے؟ شاید کبھی ملیں' لیکن کسی دوسرے روپ میں کسی نا آشنا شکل میں کسی ان دیکھے جنم میں۔

پھر بھی کسی کاپی' بھولی بسری کتاب یا کسی میز کی دراز سے اچانک مل جانے والا پرانا محبت نامہ اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسے پا کر ایک دم یوں محسوس ہوتا ہے گویا آپ گرم خوشبوؤں کے قدیم جنگلوں میں نکل آئے ہیں' جہاں کائی زدہ ویران قلعوں کی آسیبی بارہ دریوں میں بیٹھی سیاہ چشم شہزادی نے کسی کو محبت کے پرانے جنگلوں میں بلایا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں ایک محبت نامہ تھا جس کی تہ میں رکھی ہوئی سرخ گلاب کی پنکھڑیاں سوکھ چکی تھیں اور حنا کی مہک ماند پڑ گئی تھی۔ یہ محبت بھرا خط جس میں سیاہ چشم شہزادی کو لکھا گیا تھا وہ ایک خواب پرست خیال پسند لڑکی تھی۔ وہ سراپا محبت تھی' سراپا ایثار تھی۔ محبت سبھی کرتے ہیں' ایثار کوئی کوئی کرتا ہے۔ محبت بھرے خط سبھی لکھتے ہیں' محبت کوئی کوئی نبھاتا ہے۔ یہ پرانا خط جس کی سطروں میں حنا کی خوشبو ماند پڑ گئی ہے یوں شروع ہوتا ہے۔

''لالہ رخ!

اس وقت رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے اور میں اپنے کمرے میں ٹیبل لیمپ جلائے تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ بند کھڑکی کے

شیشوں سے باہر سردیوں کی زرد چاندنی خنک ہوا میں اڑی جارہی ہے۔ اس وقت دل پر بڑی مہربان سی اداسی چھائی ہوئی ہے۔ میرا دل تمہیں یاد کر رہا ہے اور تمہاری یاد مجھے ایک پرانے کشمیری لوک گیت کی یاد دلا رہی ہے۔ یہ گیت وادی کشمیر میں بانہال اور بٹوت کے درمیانی کوہساروں میں عام گایا جاتا ہے۔ میری نانی کے ماں باپ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ یہ گیت میری نانی کو زبانی یاد تھا۔ وہ بچپن میں ہمیں یہ گیت خالص وادی کی کشمیری زبان میں سنایا کرتی تھیں۔ دیوندر ستیارتھی نے اسی گیت کو بعد میں اپنی کتاب ''میں ہوں خانہ بدوش'' میں بانہال کے علاقے میں لوک گیتوں کا ذکر کرتے ہوئے قلمبند بھی کیا ہے۔ مجھے یہ گیت کشمیری زبان میں بھی یاد ہے اور اس کا ترجمہ بھی۔ میں تمہیں اس گیت کا ترجمہ سناتا ہوں۔

''ارول کے پھولوں میں تمہیں تلاش کروں گی

کیا تم ملو گے نہیں؟

جہلم نالے کے پانیوں میں تمہیں تلاش کروں گی

کیا تم ملو گے نہیں؟

خوبانی کے پیڑوں میں تمہیں تلاش کروں گی

کیا تم ملو گے نہیں؟

میرے بالوں میں چنبیلی کے پھول ہیں

میرے پاؤں میں راستوں کی گرد ہے

کیا تم ملو گے نہیں؟''

شاید یہ گیت کسی مجبور دختر کشمیر کا ہے جس نے دیکھا ہے کہ بہار آ گئی ہے۔ ارول اور چنبیلی کے پھول کھل گئے ہیں اور جہلم نالے کا پانی شفاف پانی اچھل اچھل کر بہہ رہا ہے اور خوبانی کے پیڑ گلابی شگوفوں سے لد گئے ہیں۔ لیکن اس کے پاؤں میں غریبی کی زنجیریں ہیں۔

ایسا ہی ایک گیت میں نے رنگون میں سنا تھا۔ یہ دریائے ایراوتی کے ماہی گیروں اور ملاحوں کا گیت تھا۔

''ایراوتی! ایراوتی!

تو اتنی اداس کیوں ہے؟

تو اتنی اداس کیوں ہے؟

تو نے یہ رقص کہاں سے سیکھا؟

کیا اس موڑ پر سے جہاں دریا اپنا دھارا بدلتا ہے

ایراوتی تیری لہروں پر ہم کشتی کھیتے ہیں

اور ہمارے بچے رات کو بھوکے سوتے ہیں

ایراوتی تیری لہروں میں ہمارے آنسو گرتے ہیں

ایراوتی! اری او ایراوتی!

تو اتنی اداس کیوں ہے؟''

دریائے ایراوتی کی لہروں نے اداسی میں جو گیت گایا وہ مجھے آج بھی یاد آ رہا ہے لیکن میرے دل پر تمہاری کل کی ملاقات کی یاد نقش ہے۔ کل چمکیلے سورج نے مجھ سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا تھا اور میرا سارا جسم سنہرا ہو گیا تھا اور آج میں اپنے آپ کو چھپائے چھپائے پھر رہا ہوں' جیسے سونے کا بن گیا ہوں۔ تمہارا سنہرا دماغ میرے دل و دماغ کا ہالہ کئے ہوئے ہے۔ تمہاری محبت ''گہرے سمندر میں سوئے ہوئے سیپ'' کی طرح مجھے مل گئی ہے' جس کا سینہ دہکتے ہوئے سچے موتیوں سے لبریز ہے۔ میں نے ان موتیوں کو اپنے دل میں سجا لیا ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے اور کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے سورج دل بن کر میرے سینے سے طلوع ہو رہا ہے۔ تمہاری محبت نے میرے کردار کو عظمت دی ہے۔ مجھے پاکیزگی' سچائی اور نیکی کا راستہ دکھایا ہے۔ اس نے مجھے وہ سنہری پر عطا کئے ہیں جنہیں اپنے بازوؤں پر لگا کر میں تاریک بادلوں کو چھوڑ کر نیلگوں فضاؤں میں اڑا چلا جا رہا ہوں۔

لالہ رخ! ہم نے ایک دوسرے کو محبت کی روشنی عطا کی ہے اور ہم گلاب کے خوشبودار اندھیروں میں روشنیوں کے چاند طلوع کریں گے۔ میں نے ہمیشہ تمہارے خیال کے ساتھ حسن' روشنی اور نیکی کے سازوں کو جھلملاتے دیکھا ہے۔ میں جب تمہیں خط لکھ رہا ہوتا ہوں تو میرے چہرے پر صبح کا اجالا ہوتا ہے اور میرے قلم میں گلاب کی خوشبو ہوتی ہے اور اس میں ہر پھول لفظ بن کر کاغذ کے تختے پر گرتا ہے۔ میں نے تمہارے خطوں میں ہر سطر کے نیچے محبت کے چراغ دیکھے ہیں اور ہر صفحہ پر روشنی اور خوشبوؤں کی سنہری کرنیں جگمگاتی دیکھی ہیں۔ مجھے طلوع ہوتے ہوئے سورج سے بڑی محبت ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس زمین پر سورج صرف میرے لیے طلوع ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ سورج کے طلوع ہونے سے قبل بیدار ہوتا ہوں اور اس کا خیر

مقدم گھر سے باہر' دور۔۔۔۔۔۔۔ ہرے بھرے کھیتوں میں جا کر کرتا ہوں۔ میں کسی درخت کے پاس کھڑے ہو کر سورج کے سنہری تھال کو آہستہ آہستہ بلند ہوتے دیکھتا ہوں اور میرا سر خدا کی عقیدت اور محبت میں اپنے آپ جھک جاتا ہے۔ یہی وہ پر اسرار ہستی ہے جو راتوں کو تاروں کے فانوس جلاتی ہے اور پھولوں میں خوشبوؤں کی اگر بتیاں سلگاتی ہے اور پھلوں میں میٹھے رس ڈالتی ہے جو ندی نالے بن کر خیابانوں سے گزرتی ہے اور دریا بن کر سمندروں میں گرتی ہے۔

صبح سویرے جب مدھم پڑتے ستاروں کے الوداعی گیت سنتا ہوں اور آسمان پر صبح کاذب کی نیلگوں جھلکیاں دیکھتا ہوں تو منہ اندھیرے کی ان چھوئی تازہ ہوا میں مجھے سب سے پہلے تمہارا خیال آتا ہے۔ میرے ذہن میں سب سے پہلا شگوفہ پھول بنتا ہے اس کی نازک پنکھڑیوں پر تمہاری یاد کی شبنم ٹپک رہی ہوتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا میرے دل میں بھی صبح ہو رہی ہے۔ میرے سینے میں بھی کوئی سورج طلوع ہو رہا ہے۔ لالہ رخ! آج میں نے تمہیں ہر لمحے یاد کیا۔ آج کے رنگین البم میں کوئی ورق سادہ نہیں گیا۔ میں اس وقت بھی تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ اور تمہارے خیال کے ساتھ ہی جیسے کوئی نازک ہاتھ نرگس کے زرد پھولوں کا گچھا میرے ہونٹوں کے پاس آ یا لے آیا ہے اور مجھے اپنے آپ پر سبز پتیوں والے چینی گلدان کا گمان ہو رہا ہے' جس میں چیری کے گلابی شگوفے سجے ہیں۔ آج میں کسی تالاب میں کھلا ہوا کنول ہوں' کسی جھیل پر جھکا ہوا ناریل کا درخت ہوں' بانس کے جھنڈوں سے جھانکتا ہوا زرد چاند ہوں' غریب بچے کی آنکھوں میں کانپتا ہوا آنسو ہوں' تمہاری محبت کی نازک بیل نے میرے سارے بدن کو اپنے پھولوں میں ڈھانپ لیا ہے۔ تم جس ٹہنی پر انگلی رکھو گی' میں پھول بن کر کھل اٹھوں گا۔

''آہ! محبت اداس ہے

مگر اس سے بڑھ کر ہمیں اس دنیا میں اور کیا چاہیے!''

◆◆◆

بارش والی رات

دسمبر جنوری کا مہینہ تھا۔ دن بھر ہلکی بارش ہوتی رہی تھی۔ رات کے نو دس بجے تھے۔ بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں پری سے ملنے اس کی دکان پر گیا' وہ دکان کے پٹ بند کئے اندر بجلی کی روشنی میں کام کر رہا تھا۔ میں دوکان میں داخل ہوا۔ اندر کی فضا نیم گرم تھی اور فضا چرس کے دھوئیں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ پری نے بورڈ پر تصویر بناتے ہوئے مجھے نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور بولا۔

''آؤ یار' بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ چائے منگواؤں؟''

''نہیں' میں پی کر آ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ یہ سنتوش کمار کی تصویر بنا رہے ہو کیا؟''

پری ہنس دیا۔

''بنا تو سنتوش کمار کی تصویر رہا ہوں' لیکن اس کا فیصلہ سینما کا منیجر ہی کرے گا کہ یہ سنتوش کمار کی تصویر ہے یا بھارت بھوشن کی۔''

ان دنوں میں ایک جذباتی حادثے کی وجہ سے بڑا اداس اداس رہا کرتا تھا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے ٹھنڈا سانس بھرا تو پری بولا۔

''کیوں یار! یہ ٹھنڈے سانس کیوں بھرنے لگے۔۔۔۔۔۔۔ کہیں عشق وشق تو نہیں ہو گیا؟''

میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں پری' ویسے ہی طبیعت اداس ہے۔ پری نے سر جھٹک کر کہا۔

''تم لاکھ چھپاؤ' عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتے۔ یہ عشق بڑی ظالم شے ہے۔ اس نے مہینول کی ران چیری' سوہنی کو دریا میں ڈبویا' سسی کو تھلوں میں مروایا اور خود مجھے برباد کر رہا ہے۔ اس روز ایلس میرے ساتھ تھی۔ کل وکٹر کے ساتھ سینما دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا' مجبور ہوں۔ وہ بادشاہ زادی ہے' اس کی جس کے ساتھ مرضی ہوتی ہے چلی جاتی ہے۔''

پری خاموش ہو گیا اور بڑی بے دلی سے بورڈ سنتوش کمار یا بھارت بھوشن پر برش پھیرنے لگا۔ لاہور ہوٹل والے بیرے کے بیس روپے ہو گئے ہیں۔ تین بار مسلسل ایلس وہاں بیٹھ کر میرے حساب سے زیادہ کھا گئی اور مجھے ہر بار بیرے کی منت سماجت کرنی پڑی۔ اس سے ادھار کرنا پڑا۔ یہ بورڈ جو بنا رہا ہوں اس کے کل پچاس روپے ملیں گے۔ تیس روپے ایڈوانس لے چکا ہوں۔ باقی بیس ہوٹل کے بیرے کو دے دوں گا۔ معلوم نہیں اگلا ہفتہ کیسے گزرے گا۔ اس اتوار کو ایلس مجھے ضرور ملنے آئے گی اور مجھے یقین ہے

کہ پچھلی اتوار کے ناغے کی بھی کسر نکالے گی اور خوب کیک پیسٹری اڑائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے پھر بیرے کے قرض مانگنا پڑے گا۔ ہائے ہم غریب کیا خاک عشق کر سکتے ہیں؟ بھائی عشق کرنے کے لیے تو کپڑے کی مل ہونی چاہیے۔ نہا دھو کر بہترین تھری پیس سوٹ پہن کر کار میں اپنی محبوبہ کے ساتھ مال پر نکلے۔ شیزان میں کھانا کھایا۔ پلازہ میں فلم دیکھی اور کوٹھی کے گرم بیڈ روم میں آ کر سو گئے۔ ہائے ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔ کیا بات کر گیا ہوں میں۔ خدا کی قسم میں دس مرتبہ بھی پیدا ہوں تو بھی یہ چیز نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہاں تو سوائے قرض، بھارت بھوشن کی ناک اور چرس کی سگریٹوں کے اور کچھ نہیں۔ لنڈے سے پچھلے برس بارہ روپوں میں ایک گرم سوٹ مل گیا تھا۔ ہر اتوار کو اسے پہن کر گرجے جاتا ہوں۔ ہفتے کی ساری رات اسے برش مار مار کر صاف کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ ایک روز ظالم ایلس نے یہ کہہ ہی دیا کہ ڈیئر پری تمہارے پاس بس ایک ہی سوٹ ہے۔ وکٹر تو ہر اتوار کو نیا سوٹ پہن کر آتا ہے۔ میرا کلیجہ کباب ہو گیا مگر کیا کرتا تھا خاموش ہو رہا۔

پری خود ہنس پڑا اور چرس بھرا سگریٹ زمین پر رگڑ کر بجھانے لگا۔ دوکان کی بند فضا میں اس کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے ایک معمولی رنگ ساز بیٹھا ہوا تھا، جس کے پاس پچھلے چار سالوں سے اتنے پیسے بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ ایک نئی پتلون ہی خرید سکتا۔ روز صبح سے شام تک بورڈ لکھتا تھا جو بلا پتلا تھا اور شاید ٹی بی کا مریض بھی تھا جو ایک ہرجائی لڑکی سے پیار کرتا تھا۔ باقاعدگی سے گرجے جاتا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام سے محبت کرتا تھا۔ لیکن وہ اس دوکان میں اس محلے میں اس شہر، اس ملک میں بالکل اکیلا تھا۔ جہاں نہ اس کی ماں تھی اور نہ بہن بھائی۔ اس کی زندگی میں سوائے چرس، لنڈے کے سوٹ، معمولی معاوضے کے انتھک کام اور ایک بے وفا محبوبہ کے اور کچھ نہیں تھا، مگر اس کی رگ رگ میں زندگی بسر کرنے کا جوش، کام کی لگن اور امیدوں، آرزوؤں کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ لیکن یہ چنگاریاں پانی کے چھینٹوں میں بدل رہی تھیں اور وہ کبھی کبھی اپنی مرحومہ ماں اور اپنے جالندھر والے مکان کو یاد کر کے اداس ہو جاتا۔ اس کی اداسی میں موت کی مردنی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اداسی بڑی رومانٹک ہوتی۔

"یار! کیا کبھی ایلس سے میری شادی ہو سکے گی؟

شاید کبھی نہیں۔

خدا کی قسم اگر ایلس مجھ سے شادی کر لے تو ساری زندگی اسے پھولوں کی طرح رکھوں۔ اتنا کر دوں کہ وہ پریشان ہو جائے۔"

میں نے کہا۔

"اور اگر ایلس نے وکٹر سے شادی کر لی تو۔۔۔۔۔۔؟"

پری کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بڑی مسکینی سے بولا۔

"کیا کر سکتا ہوں، وہ بادشاہ زادی ہے اور میں بے پر فقیر ہوں۔۔۔۔۔۔ مگر یار! یہ بڑا ظلم ہوگا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے رنگ سے بھرا ہوا برش اینٹ پر رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"بس لالہ! اب کام نہیں ہوتا۔ جی اکھڑ گیا ہے کام سے۔ کیا فائدہ اس کام کا؟"

پری نے کونے میں رکھا ہوا گھڑا گود میں لیا، قمیص کی بکل ٹھیک کی اور گھڑا بجاتے ہوئے گانے لگا۔

"دوپترا ناراں دے

ساڈا دکھاں کے رندے پتھر پہاڑاں دے"

پری کی آواز غریبی کے درد و سوز میں جھلتی جا رہی تھی۔ گھڑے کی لے بوجھل اور سست پڑتی جا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ وہی گھڑا ہے جس پر لیٹ کر سوہنی دریا پار کرتی تھی۔ اگر اس پنجابی ماہیے کی طرز کو خوشبو میں تبدیل کیا جا سکتا تو وہ یقیناً حنا کی باسی مہک بن جاتی جو پرانے محبت بھرے خطوط کی کسی صندوقچی سے اٹھ رہی ہو۔ پری کا دل رو رہا تھا۔ اپنی پیاری ماں کی یاد میں جس کا مرتے سمے وہ چہرہ بھی نہ دیکھ سکا۔ ایلس کے لیے جو ہرجائی تھی جس کے دل میں پری کے لیے ذرہ برابر بھی محبت نہیں تھی جو محض اس کا مال ہضم کرنے کے لیے اس سے ملتی تھی اور پری ہوٹل کے بیروں سے ادھار مانگتا تھا۔ یہ حقائق اس قدر تلخ تھے کہ ان کا زہر پری کے جسم میں سرایت کر گیا۔ اب اسے گانا بھی زہر لگتا تھا۔ اس نے گھڑا ایک طرف رکھ دیا۔ برش دوبارہ ہاتھ میں لے کر گہرا سانس بھرا اور اسے بورڈ پھیرنے لگا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"یار! کسی وقت خیال آتا ہے کہ میں کسی امیر آدمی کے گھر پیدا کیوں نہیں ہو گیا؟ میرے پاس بھی کار ہوتی۔ خوبصورت ایلس ایسی بیوی ہوتی۔ آخر مجھ میں کیا برائی ہے؟ کیا میں انسان نہیں؟ کیا ان چمکیلی کاروں میں گھومنے والوں کے چار چار کان ہیں؟ چھ چھ آنکھیں ہیں؟ میں بھی ان جیسا انسان ہوں۔ پھر میں ان کی طرح کیوں نہیں ہوں؟ وہ میری طرح کیوں نہیں ہیں؟ کیا میں صبح سے رات گئے تک کام نہیں کرتا؟ پھر میرے پاس اچھے اچھے کپڑے، موٹر کار اور ایلس ایسی بیوی کیوں نہیں ہے؟ آخر یہ بے انصافی کون کر رہا ہے؟ کیا اسے کوئی روک نہیں سکتا؟ کیا کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ بے انصاف کا ہاتھ روکے؟

پری کی آواز میں تلخی آ گئی۔ اس نے زور سے کونے میں تھوکا اور اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے بورڈ پر چلنے لگا۔ آج اس بات کو کئی برس گزر چکے ہیں۔ سنا ہے پری کراچی میں ہے اور سینما کی پبلسٹی کا بزنس کرتا ہے اور اس کے پاس اپنا دفتر، اپنی چمکیلی کار ہے جس میں

وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کلفٹن کی سیر کو جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ ایلس کو بھول چکا ہوگا اور اس بوسیدہ دوکان کو بھی جہاں بیٹھ کر وہ بورڈوں پر تصویریں بنایا کرتا اور گھڑے پر درد بھرے گیت گایا کرتا تھا۔

◆◆◆

دلی.........تیس ہزاری

میں سترہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں پہلی بار دلی گیا۔

میرے ساتھ بڑی بہن صاحب اور ان کا شوہر بھی تھا۔ یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے کر امرتسر سے رنگون جا رہے تھے۔ لدھیانہ سٹیشن پر بھائی جان کے دوست ظفر نیازی صاحب کھانا لیے کھڑے تھے۔ لمبا گھنگھریالے سیاہ بال آنکھوں پر چشمہ اور چہرے پر مسکراہٹ۔ خدا جانے آٹھ دس مرغے بھون کر لائے تھے ساتھ پراٹھے تھے جتنی دیر لدھیانے سٹیشن پر گاڑی کھڑی رہی وہ بھائی جان کے پاس بیٹھے یہی معذرت کرتے رہے۔

''مجھے افسوس رہے گا کہ بھائی جان کو لے کر دو ایک دن کے لیے ہمارے ہاں نہیں اترے۔''

گاڑی چلی تو وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں خدا حافظ کہتے رہے۔ فسادات کے ہولناک دنوں میں جب میں لدھیانے سٹیشن سے گزرا تو پلیٹ فارم پر مسلمان عورتیں' بچے' بوڑھے' جوان اپنا سامان لیے ہجوم در ہجوم بیٹھے تھے اور جنگلے کے پار سکھ ہندو تلواریں لیے انہیں دیکھ رہے تھے۔ مجھے نیازی صاحب کا خیال آیا' خدا جانے وہ کہاں ہوں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خیریت سے پاکستان پہنچ گئے ہیں اور راولپنڈی میں آباد ہیں۔

دلی کا سٹیشن میں نے پہلی بار دیکھا' لاہور سے بڑا تھا۔ چاروں طرف خوب رونق تھی۔ ن م راشد صاحب پلیٹ فارم پر تشریف لائے ہوئے تھے' ہم تانگوں میں بیٹھ کر راشد صاحب کی کوٹھی کی طرف چل پڑے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک دروازے سے نکل کر ہم دلی شہر سے باہر آ گئے' یہاں سڑک پر بڑے گھنے درخت تھے۔ راشد صاحب کی کوٹھی کے وسیع باغ میں بھی بہت گنجان درخت تھے۔ میں یوں ہی ادھر ادھر گھومتا ایک کمرے میں چلا گیا۔ کونے میں ''ادب لطیف'' اور ''ادبی دنیا'' کے رسالوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ادب لطیف کے ایک شمارے کے ٹائٹل پر کرشن چندر' بیدی' اوپندر ناتھ اشک' سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر کی تصویریں چھپی تھیں۔ میں کتنی دیر یہ رسالے دیکھتا رہا۔ گرمیوں کا موسم تھا' شام کو بڑی خوشگوار ہوا چلنے لگی۔ رات کو میرا پلنگ رات کی رانی کی جھاڑیوں کے پاس لگا دیا گیا۔ ساری رات ٹھنڈی ہوا چلتی رہی اور رات کی رانی کی مہک اڑتی رہی۔ غالباً دوسرے روز ہم دی سے کلکتہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

دوسری بار دلی آیا تو دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ بہن صاحب تیس ہزاری میں بھیرو جی کے مندر کے پاس رہتی تھیں۔

یہاں سمن آباد کے این ٹائپ کی طرز کے کوارٹروں کی ایک قطار چلی گئی تھی۔ پہلے کوارٹر میں دتہ صاحب رہتے تھے' دوسرے میں بھائی جان' تیسرے کوارٹر میں کرشن چندر' چوتھے میں اوپندر ناتھ اشک' پانچویں میں سعادت حسن منٹو اور چھٹے میں ن م راشد صاحب قیام پذیر تھے۔ اس علاقے کے بارے میں کرشن چندر نے ایک کہانی ''بھیروں جی کا مندر'' اور اوپندر ناتھ اشک نے غالباً ''کوارٹر نمبرے'' یا ''فلیٹ نمبرے'' افسانہ لکھا جس میں اس نے کوشلیا دیوی کے ساتھ اپنے چوری چھپے دوسرے شادی کا حال درج کیا ہے۔ اوپندر ناتھ اشک کی بیوی کوشلیا چھوٹے قد کی گول مٹول سی پنجابی ہندو لڑکی تھی۔ اوپندر ناتھ اشک کی ایک بیوی لاہور میں تھی۔ یہ اس کی محبت کی شادی تھی۔ کیونکہ ان محفلوں میں بطور ایک طالب علم کے بیٹھ کر جو باتیں اشک کے بارے میں میرے کانوں میں پڑیں' ان کے مطابق اوپندر ناتھ اشک محبت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بے حد کنجوس' حاسد' متعصب اور تنگ نظر ہندو تھا۔ حالانکہ وہ بڑا اچھا لگتا تھا اور میں اس کے ڈرامے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ وہ قہقہہ بڑا زوردار لگایا کرتا تھا۔ ایک شام وہ ہمارے آنگن میں آیا۔ ہم آم کھا رہے تھے۔ بھائی جان نے اسے بھی پلیٹ میں آم کاٹ کر دیئے۔ جانے کس بات پر اوپندر ناتھ اشک نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ مجھے وہ کھوکھلا اور بناوٹی معلوم ہوا۔ بعد میں جب راجہ مہدی علی خان بھی اس منڈلی میں آن ملے تو مجھے یاد ہے ایک روز یہ سارے نامور ادیب اشک ہی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ مجھے چونکہ لوگوں کی باتیں سننے کا شوق تھا اس لیے میں ان کی محفل میں ضرور کہیں نہ کہیں جا دبکتا تھا۔ اس روز بھی میں ایک طرف دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بھائی جان نے کہا۔

''اشک دنیا کا واحد آدمی ہے جو ہر ماہ چھ سو روپے کماتا ہے اور ان میں سے سات سو روپے بچاتا ہے۔''

دراصل باتیں اشک کی کنجوسی کی ہو رہی تھیں۔ اتنے میں راجہ مہدی علی خان نے کہا۔

''اشک نے ایک بلی پال رکھی ہے' صبح صبح یہ اس بلی کو لوگوں کے گھروں میں دودھ پینے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ جب وہ خوب سیر ہو کر واپس آتی ہے تو یہ اسے دودھ نکال کر چائے بناتا ہے۔''

سامنے دیوار پر دو ایک زنانہ ریشمی دوپٹے لٹک رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں' میرا خیال ہے کہ منٹو صاحب نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

''اشک کمینہ ہے' اس نے مہمانوں پر رعب جمانے کے لیے اپنی بیوی کے سارے ریشمی دوپٹے لٹکا رکھے ہیں۔''

سب لوگ ہنس رہے تھے۔ اشک بھی بڑھ چڑھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کی دوسری بیوی کوشلیا دلی کی کسی فرم میں بطور ٹائپسٹ ملازم تھی اور میرے سامنے روز صبح کو اسے بائیسکل کے پیچھے بٹھا کر دفتر چھوڑنے جایا کرتا تھا۔ کوشلیا کی میری بہن سے بڑی دوستی تھی۔ وہ روز شام کو ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ وہ پان بہت کھاتی تھی۔ تیس ہزاری کے ان کوارٹروں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے خشک

پہاڑی ٹیلے تھے' سامنے جامن' آم اور نیم کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ساون میں دھوبنوں کی لڑکیاں ان درختوں میں جھولے جھولتیں اور گیت گایا کرتیں۔ نیم کے گہرے سبز جھنڈوں' تیز بارش کی بوچھاڑیں' آم کے درختوں میں کوئل کی کوکو' جھولے جھولنے والیوں کے گیت۔۔۔۔۔۔۔ میں برآمدے میں بیٹھا اداس ہو جاتا اور مجھے امرتسر کا کمپنی باغ یاد آنے لگتا۔ وہ بھی برسات کی ایک رات تھی۔ دلی کا آسمان گہرے سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ بارش شام سے رکی ہوئی تھی۔ ہم لوگ عقبی صحن میں چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک ساتھ والے کوارٹر سے کسی عورت کے زور زور سے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم پریشان ہو کر اٹھ بیٹھے۔ آپا نے ایک بڑے ہندو ادیب کا نام لے کر کہا۔

''وہ پھر اپنی بیوی کو پیٹ رہا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد عورت کے چیخنے کی آوازیں آہستہ آہستہ رونے اور پھر سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔

ایک روز اچانک راجہ مہدی علی خان بھی تیس ہزاری میں آ گئے۔ انہوں نے ہمارے کوارٹر کے ایک کمرے میں ڈیرہ جما لیا۔ گول مٹول بھدا بھاری کم جسم' توند بڑی ہوئی' گندمی چہرے پر ہر لحظہ کھیلتی ہوئی شرارت آمیز مسکراہٹ' راجہ مہدی علی خان ہر روز صبح سویرے سیر کو جاتے۔ ایک روز مجھے کہنے لگے۔

''میں سیر کو اس لیے جاتا ہوں کہ یہ جو میری گردن سور کی طرح موٹی ہو گئی ہے' صراحی دار ہو جائے۔''

ان ہی دنوں میں ایکٹر بننے کی شوق میں بمبئی گیا۔ وہاں دربدری' فاقہ مستی اور خواری کے بعد امرتسر جانے کی بجائے نئی دلی کے سٹیشن پر اتر گیا اور پیدل ہی تیس ہزاری کی جانب چل پڑا۔ عقب سے ہوتے ہوئے جب میں تیس ہزاری کے خشک ٹیلوں پر پہنچا تو سامنے سے راجہ مہدی علی آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ' ہنس کر بولے۔ ''کیوں یار! ہیرو بن گئے؟''

مجھے اس وقت راجہ صاحب کی بات بڑی بری لگی۔ ویسے خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے وہ مجھ سے بڑی شفقت کیا کرتے اور پیار سے میدا پہلوان امبرسریا کہا کرتے تھے۔ ایک دن مجھے کہنے لگے۔ ''آؤ' تمہیں ایک انگریز عورت کی دوکان سے پان کھلاتا ہوں۔'' اور مجھے علی پور روڈ پر آل انڈیا ریڈیو کے قریب میڈن ہوٹل کے باہر لے آئے۔ سامنے ایک مدراسی بوڑھی کھوسٹ کالی بھجنگ عورت فٹ پاتھ پر پان بیڑی کا خوانچہ رکھے بیٹھی تھی۔

''یہ ہے وہ انگریزنی پان والی!''

◆◆◆

مختار قریشی کی شہادت

دلی کی تیس ہزاری میں تھا تو کبھی بھائی جان کے ساتھ کبھی اکیلا اور کبھی راجہ مہدی علی خاں کے سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر ریڈیو سٹیشن جاتا' وہاں زیادہ تر ن م راشد صاحب کے کمرے میں بیٹھا انگریزی اردو رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ بیچ میں تھوڑی دیر کو اٹھ کر ریڈیو سٹیشن کے برآمدوں کمپاؤنڈ اور کینٹین وغیرہ کی طرف نکل جاتا۔ ان جگہوں پر یونہی بے مقصد گھومتا رہتا۔ ایک دن اسی طرح چکر لگا رہا تھا کہ کانوں میں کسی لڑکی کے نعت پڑھنے کی گھریلو قسم کی آواز آئی۔ ایک سپیکر کھلا تھا' اندر کوئی نہیں تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور نعت سننے لگا۔ معلوم ہوا کہ جو لڑکی نعت پڑھ رہی ہے اس کا نام سحاب قزلباش ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اس لڑکی کو سٹوڈیو کے کوریڈور سے گزرتے دیکھا اس کا قد چھوٹا اور آنکھیں ہرنی ایسی تھیں۔ شکل فلم شاردا کی ہیروئن نرملا سے بڑی ملتی جلتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد غالباً ۱۹۵۳ء میں' میں لاہور کے مال روڈ ریستوران چائینز لنچ ہوم میں تھا' کراچی کے ایک گورے چٹے درمیانی عمر کے صاحب مجھے ملنے آئے۔ وہ کراچی میں کسی ماہنامہ کے ایڈیٹر تھے' میں اب ان صاحب کا اور ان کے پرچے کا نام بھول گیا ہوں' انہوں نے کھل کر تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ سحاب قزلباش کے چچا ہیں۔ چونکہ میں سحاب قزلباش کی آواز سے بڑا متاثر ہوا تھا اس لیے میں نے ان کے رسالے کے لیے صدق دل سے دو تین افسانے لکھے' چھ سات برس بعد اعجاز بٹالوی نے ریگل کے چوک میں ساڑھی میں ملبوس عورت سے میرا تعارف کروایا۔ یہ سحاب قزلباش تھی۔ اس کے بعد میرے اور انور جلال شمزا کے مشترک دوست فوٹو گرافر سے شادی کر لی اور میری نظر میں سحاب قزلباش پہلے سے زیادہ باعزت ہو گی۔

تیس ہزاری سے اٹھ کر ہم لوگ تیار پور میں آئے تو میں اور مختار قریشی صبح اکٹھے تیار پور والے گھر سے نکل کر ریڈیو اسٹیشن جاتے۔ دلی ریڈیو سٹیشن پر زیادہ دیر اس کے ساتھ رہتا اور اسے پیانو پر دھنیں کمپوز کرتے اور آرکسٹرا مرتب کرتے دیکھا کرتا' لیکن بیچ میں وقت نکال کر ن م راشد صاحب کے پاس ان کے کمرے میں ضرور جاتا' اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے بڑی شفقت اور بڑا پیار کرتے تھے بلکہ اس لیے کہ میں بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب میں نے افسانے لکھنے شروع کئے تو میری راشد صاحب سے پشاور میں ان کی کوٹھی پر ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں ریڈیو پاکستان پشاور کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ وہ میرے افسانوں سے خوش بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ متاثر بھی۔ بہر حال میرے لیے یہ بڑا اعزاز تھا۔

دلی میں اب میرا ایک ہی یار تھا اور وہ تھا مختار قریشی۔۔۔۔۔۔۔ دلی ریڈیو سٹیشن کا نوجوان کمپوزر' مغربی موسیقی کے امتحان میں اول آنے والا۔ دیسی راگوں کی نوٹی فیکشن کرنے والا' ریڈیو کی کمپوزیشنوں سے نکل کر بمبئی فلم انڈسٹری میں اپنی دھنوں سے انقلاب برپا کرنے کا آرزو مند۔ ہم دونوں نئی دلی اور پرانی دلی کی سڑکوں' گلی کوچوں' پارکوں اور قدیم باغوں کی خوب آوارہ گردی کرتے ایک روز دلی شہر کی آوارہ گردی سے واپس آتے ہوئے کشمیری دروازے سے نکل کر علی پور روڈ پر آئے تو دائیں ہاتھ کو قدسیہ گارڈن کا پرانا تاریخی تباہ حال دروازہ نظر آیا۔ مختار قریشی نے کہا۔

''آیئے' اندر چلئے۔''

قدسیہ گارڈن دلی کے تاریخی اور بے توجہی کا شکار قدیم مغلیہ باغات میں سے تھا۔ پرانے دروازوں کی محرابوں پر جنگلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ روشوں کے پتھر اکھڑے ہوئے تھے۔ اندر جا کر ایک چبوترہ نظر آیا جس پر سنگ مرمر کی دو چار سلیں ہی باقی تھیں۔ روشوں کی سرخ چھ سرخی ستارہ نما اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھیں اور ان میں گھاس اگ رہی تھی۔ عجیب وغریب قسم کے قدیم گھنے' دیو مالائی درختوں پر چوڑے پتوں والی بیلیں چڑھی تھیں جن میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ یہ منظر مجھے ایک خوبصورت رومانٹک خواب کی مانند یاد ہے اور میں اسی طرح اسے بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اور مختار قریشی اسے اجڑے ہوئے ویران باغ میں ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گئے۔ مختار قریشی نے حسب عادت موسیقی کی باتیں شروع کر دیں۔ مجھے اس کی ایک بات بہت پسند تھی وہ یہ کہ مختار قریشی موسیقی پر باتیں کم کرتا اور گا کر زیادہ سناتا تھا اس روز اس نے (مجھے اچھی طرح یاد ہے) راگ بھوپالی کے بارے میں بتایا جو میں بالکل بھول گیا ہوں لیکن میرے ذہن کے البم میں اس کی شکل اس طرح محفوظ ہے جب وہ راگ بھوپالی کی تفصیلات مجھے بتا رہا تھا اور اس کے سبزی مائل چہرے پر غروب آفتاب کی خوں فشاں لالی آ گئی تھی اور پھر وہ آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ کو اوپر اٹھا کر نچاتے ہوئے راگ بھوپالی کی استھائی اور انترہ گا رہا تھا اور میرے ارد گرد دلی کے زوال پذیر مغلئی باغ پر شکوہ درختوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ اس نے ایک بار ہاتھ کو زور سے نیچے مارا تو ایک گلہری ڈر کر نیم کے درخت پر چڑھ گئی۔ میں اس گلہری کو اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ آج اتنے سالوں کے بعد مجھے وہ گلہری یاد آ رہی ہے۔ کیا آج بھی وہ دلی کے قدسیہ گارڈن میں ہو گی۔۔۔۔۔۔۔ یا ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہجرت کر گئی ہو گی؟

غالب کی قبر میں نے پہلی مرتبہ مختار قریشی کے ساتھ دیکھی۔ اب تو غالب کی قبر پر سنگ مرمر کی بارہ دری کا سایہ ہے مگر ان دنوں وہ مومن اور دلی کے دروازے قدیم غزل گو شعراء کی طرح کسمپرسی کے عالم میں تھا۔ غالب کو میں سہگل کی گائی ہوئی غزل۔۔۔۔۔۔۔

''نکتہ چیں ہے غم دل کو سنائے نہ بنے'' ۔۔۔۔۔۔ کے حوالے سے جانتا تھا اور میری سمجھ میں اس کا کوئی شعر بھی نہ آتا تھا۔ ہم دونوں نئی دلی سے نکل کر قطب صاحب کی لاٹھ گئے وہاں سے خدا جانے کدھر کدھر سے آتے ہوئے پرانے قلعے کے دیو قامت دروازے کے سامنے کھڑے تھے یہ پرانا قلعہ دلی کے لال قلعے کے مقابلے میں ویران اور اجڑا ہوا تھا' یوں لگتا تھا کہ یہ جنوں بھوتوں کا قلعہ ہے وہاں سے ہو کر ادھر ادھر کی آوارہ گردی کرتے' ہم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ پہنچ گئے۔ اندر جا کر نیچے اترتی سیڑھیوں والی باؤلی دیکھی پھر ایک بیٹھک دیکھی۔ مختار قریشی نے کہا۔

''یہاں خواجہ حسن نظامی رہتے تھے۔''

عقب میں قبرستان تھا جہاں جھاڑیوں اور درختوں میں ادھر ادھر پرانی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک احاطے کی ڈیوڑھی گزر کر اندر گئے تو یہاں غالب کی قبر تھی۔ سنگ مرمر کا کتبہ ایک طرف جھک گیا تھا اور مجھے یاد ہے اس کتبے پر شعر لکھا تھا' اس میں ''ہاتف'' کا لفظ بھی تھا جس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ہاتف کس کا نام ہو سکتا ہے۔ واپسی پر میرے پیر میں کانٹا چبھ گیا۔ میں احاطے کی ڈیوڑھی میں بیٹھ گیا اور مختار قریشی نے ایک اور کانٹے سے میرے تلوے سے کانٹا نکالا' پھر ہم دونوں وہاں سے نکل کر پرانی دلی کی طرف چل پڑے کچھ فاصلہ سواریوں والے تانگے میں کیا' کچھ فاصلہ ٹرام پر طے کیا۔ اب ہم جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے تھے۔ یہ مسجد بہت بڑی تھی۔ ہمارے امرتسر میں مسجدوں کے صحن اتنے بڑے نہیں تھے۔ دلی کی جامع مسجد کا صحن بہت وسیع تھا۔ سیڑھیوں کے آس پاس کباب والوں کے کھوکھے تھے۔ سامنے ایک مزار تھا جس پر سبز چادر چڑھی ہوئی تھی اور ایک طرف نل میں سے پانی بہہ رہا تھا۔ دلی کی قیامت خیز گرمی میں اس منظر سے مجھے آنکھوں میں بڑی ٹھنڈی محسوس ہوئی۔ میں اور مختار قریشی اب بازار چتلی قبر کی گلیوں میں داخل ہو گئے (مجھے یہ بات بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ اس بازار کا نام چتلی قبر تھا) ہم بے مقصد گلیوں گلیوں گھومتے پھرے۔ پرانی طرز کی لکڑیوں کی بالکونیوں اور چھجوں والے مکان تھے۔ بچے مکانوں کے باہر کھیل رہے تھے۔ ایک گلی میں کچھ قبریں بھی نظر آئیں ایک جگہ کوئی نٹ تنی ہوئی رسی پر چل رہا تھا نیچے بچے تالیاں بجا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک میں اور مختار قریشی وہاں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے رہے۔ دلی کے ان تاریخی گلی کوچوں کی آوارہ گردی کے بعد جب ہم واپس تیار پور پہنچے تو شام ہو چکی تھی اور علی پور روڈ والے نیم کے درختوں میں گہرے اندھیروں کے سائے ابھرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کی گھنی شاخوں میں بسیرا لیتی چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ میرا دل ایک دم اداس ہو گیا اور مجھے اپنی محبوبہ یاد آ گئی جو شادی کے بعد دلی میں حوض قاضی کے پاس ایک مکان میں رہائش پذیر تھی۔ مجھے سہگل اور کانن دیوی کے اداس اداس گانے یاد آنے لگے پھر مجھے یوں لگا جیسے کسی ندی کنارے آدھی رات کو گھنے جنگل میں

ایک دیوداسی پرانے قلعے کے چور دروازے سے نکل کر اپنے محبوب کو ملنے جا رہی ہے اور مجھے پنکج کی آواز سنائی دی۔

پیا ملن کو جانا ہے
آنکھوں پر دونوں ہاتھ
جگ کی لاج من کی موج
کیسے کٹے کٹھن باٹ
بجھے دیے اندھیری رات
پیا ملن کو جانا ہے

مختار قریشی میرے ساتھ نیم کے گھنے درختوں کے نیچے علی پور روڈ کے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا' وہ کچھ گنگناتا جا رہا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی' وہ چلتے میں کچھ نہ کچھ ضرور گنگناتا رہتا اور اس کی انگلیاں حرکت کرتے رہتیں' میں نے کوئی توجہ نہ دی کہ وہ کیا گنگنا رہا ہے اور اس نے بھی مجھ سے نہ پوچھا کہ میرے ذہن میں پنکج ملک کا گیت کیوں گونج رہا ہے۔ تیار پور کی آبادی بالکل سامنے تھی کوارٹروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں ہم تھک گئے تھے۔ مختار بولا۔

''یار ذرا آرام کریں۔''

ہم دونوں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ مختار قریشی راگ داری کی باتیں کرنے لگا اس کی راگ داری کی باتیں میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ہاں جب وہ کسی راگ کی مثال دیتے ہوئے گانا شروع کرتا تو میں ہمہ تن گوش ہو جاتا اس کی آواز بڑی خشک اور پرسوز تھی۔ میں آنکھیں بند کر لیتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے سرد رات کے پچھلے پہر جنگل میں زرد پتے گر رہے ہیں اور ان خشک پتوں پر کسی ناکام محبت شہزادی کی روح اپنے بے داغ پاؤں رکھتی چل رہی ہے۔ اس وقت اس کے سانولے سبز چہرے پر ایک ملکوتی حسن جھلکنے لگتا۔ یوں لگتا جیسے اس کے چہرے کے افق سے موسیقی کا چاند طلوع ہو رہا ہے۔ سر کرنیں بن کر اس کی آواز سے پھوٹتے آواز چاندنی بن کر ہمارے اردگرد پھیل جاتی۔

جب یہ خیال آتا ہے کہ سنگیت کی روشنیاں' خوشبوؤں سے مہکتا دمکتا چہرہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ ایک مکان میں بند کر کے جلا کر بھسم کر دیا گیا تو میں ایک گہری اور حیرت انگیز سوچ میں ڈوب جاتا ہوں۔ آگ کے شعلے جب مختار قریشی کے چہرے تک پہنچیں ہوں گے تو وہ کیا سوچ رہا تھا۔ جب اسے اپنے بہن بھائیوں کی چیخیں سنائی دی ہوں گی تو وہ کیا محسوس کر رہا ہو گا؟ یقیناً اس

نے ان معصوم بچوں کو اپنی بانہوں میں گھیر لیا ہوگا پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے کیا کیا قربانیاں نہیں دیں۔۔۔۔۔۔ کیسے کیسے ہیرے موتی خاک میں رل گئے۔

مختار قریشی سے مجھے اپنی آخری ملاقات یاد نہیں۔ بس ایک روز دلی سے میں واپس امرتسر آ گیا۔ وہ ایک مہینے بعد کلکتہ چلا گیا۔ پھر بمبئی اور وہاں سے کولمبو کو نکل گیا۔ یہ سیاسی سرگرمیوں کے عروج کا دور تھا۔ ''پاکستان زندہ باد'' اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کا نعرہ شہر شہر گلی گلی گونج رہا تھا۔ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ گلی کوچوں' سڑکوں' ویرانوں میں عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور جوانوں کی کٹی ہوئی لاشیں بکھر گئیں۔ قیام پاکستان کا اعلان ہوگیا۔ مہاجرین کے تباہ حال قافلوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ہم لوگ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے' پاکستان آ گئے۔ ان ہی دنوں میں کوہ مری گیا تو وہاں میری ملاقات ایک گمنام مگر عظیم غزل گو فنکار علی بخش قصوری سے ہو گئی (یہ مجھے دس گیارہ برس بعد معلوم ہوا کہ قصور شہر کو غزل کی گائیکی میں ایک غیر فانی مقام حاصل ہے) علی بخش قصوری سیدھا سادا فنکار تھا' باتوں میں معلوم ہوا کہ مختار قریشی کا رشتے دار ہے۔ میں نے بڑی بے تابی اور شوق سے پوچھا کہ مختار کہاں ہے۔ علی بخش قصوری ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر سمیز ہوٹل کی کھڑکی کے باہر گرجا گھر کے درختوں کی سمت دیکھتے ہوئے اداس لہجے میں بولا۔

''وہ تو دلی میں شہید ہو گیا۔ جس مکان میں وہ رہتا تھا' ہندو غنڈوں نے اس کے دروازے کھڑکیوں کو بند کر کے آگ لگا دی۔ وہ اپنی بہن بھائیوں سمیت جل گیا۔''

میں علی بخش قصوری کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ مختار قریشی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے' اس کی آنکھیں بند ہیں اور اس کے چہرے کے افق سے موسیقی کا چاند طلوع ہو رہا ہے۔ سُر کرنیں بن کر پھوٹ رہے ہیں۔ آواز چاندنی بن کر پھیل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مختار کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہوں۔

نکاریں ان کو آؤ اپنے باغوں کی خبر پوچھیں
اسی گلشن سے آتی ہیں چلی یہ بلبلیں دیکھیں

◆◆◆

جھیل اور کنول

رات بھر گاڑی لنکا کے گھنے جنگلوں میں سے گزرتی رہی' میں برتھ پر چڑھ کر سو گیا۔ مجھے دو ٹرنکوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ مل گئی تھی۔ جب سے امرتسر سے چلا تھا اچھی طرح سو نہ سکا تھا۔ یہاں جو لیٹنے کی جگہ ملی تو گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ ساری رات ریل گاڑی چلتی رہی اور میں سویا رہا۔ جس وقت آنکھ کھلی دن نکل آیا تھا۔ لنکا کا آسمان گہرے سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ ٹھنڈی نم ہوا نے میرے ماتھے کو چھوا اور ہوا میں بانس کے درختوں کی مہک تھی۔ کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی جھیلیں اور بانس کے گھنے جنگل گزر رہے تھے۔ گاڑی ویسے تو چھوٹی لائن کی تھی مگر بڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ اس نے فرنٹیر میل اور مدراس ایکسپریس کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ عجیب عجیب ناموں والے چھوٹے چھوٹے سٹیشن آ رہے تھے اور گزر رہے تھے۔ ایک سٹیشن پر گاڑی پر ہلکی بارش میں کچھ لڑکیاں لکڑی کا تختیوں پر لگی میخوں میں اناس کے قتلے پھنسائے ہمارے ڈبے کی طرف آئیں۔

''پائین ایپل سر۔۔۔۔۔۔۔ ویری سویٹ سر''

میں نے ایک قتلہ خرید لیا۔

''ایک سینٹ سر''

تالی منار میں کرنسی بدل گئی تھی۔ ایک سینٹ اکنی کے برابر تھا۔ لنکا میں اکنیوں کی جگہ سینٹ چلتے تھے۔ روپیہ ویسا ہی تھا میں نے ایک سینٹ دیا اور لنکا کی اس خوبصورت لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے سفید دھوتی کس کر باندھ رکھی تھی' جس میں سے اس کے جسم کے خطوط جھانک رہے تھے۔ سیاہ بالوں کے جوڑے میں کنول کا چھوٹا سا پھول دائیں طرف جھکا ہوا تھا۔

''پائین ایپل سر''

لڑکی دوسرے ڈبے کی جانب چلی گئی اور میں اناس کی خوشبو لیتا' اس کا میٹھا رس حلق میں انڈیلتا رہ گیا۔ انجن نے سیٹی دی اور ریل اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہر مضافاتی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی اور لوہے کے جنگلے کے اوپر سرخ پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کی قطاریں جھکی ہوئی تھیں۔ گاڑی ایک بار پھر چکر کاٹتی بانس سال اور مہاگنی کے گھنے جنگلوں اور

دھان کے کھیتوں کے طویل سلسلوں میں سے گزر رہی تھی۔ اتنے گنجان جنگل میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ تاریک جنگلوں کے بیچوں بیچ گہری سبز پرسکون جھیلوں پر کنول کے سفید اور کاسنی پھول کھل رہے تھے۔ کھیتوں میں سنہالی عورتیں مردوں کے ساتھ کھیتوں میں دھان کی بوائی کر رہی تھیں۔ کہیں کیلے کے درختوں میں زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے کہیں پان کے کھیت چلے گئے تھے۔ کہیں پہاڑوں کی ڈھلانوں میں عورتیں ٹوکریاں پیچھے لٹکائے چائے کی پتیاں چن رہی تھیں دو ایک دریا بھی گزرے ان کے اوپر پل بنے تھے جن کی محرابوں پر عجیب عجیب قسم کی تصویریں کندہ تھیں۔

دن کے کوئی بارہ بجے ریل گاڑی کولمبو سٹیشن پہنچ گئی۔

کولمبو میں کولمبو نامی کوئی سٹیشن نہیں۔ کولمبو کے دو بڑے سٹیشن ہیں۔ ایک کا نام ''مراوانہ'' اور دوسرے کا نام ''فورٹ'' ہے۔ ہماری گاڑی مراوانہ ریلوے سٹیشن پر آ کر رکی۔ سنہال لوگ مدراسیوں کی طرح کے چھوٹے قد' سیاہ رنگت' دبلے پتلے اور کمزور صورت ۔۔۔۔۔۔ سفید دھوتیاں' سفید پتلونیں' سیاہ چپل' چھتریاں اور بیشتر پاؤں سے ننگے تھے۔ ریلوے کے ملازموں کا بھی یہی لباس تھا۔ سفید کوٹ اور سفید دھوتی اور سیاہ چپل۔ سٹیشن بڑا خوبصورت اور جدید وضع کا تھا۔ پلیٹ فارم کشادہ اور چھت بڑی اونچی تھی۔ سنہالی عورتیں جو اپنے رشتہ داروں کو لینے آئی ہوئی تھیں۔ اپنی طرز کی خاص اور منفرد خوبصورتی کی مالک تھی۔ ان کے رنگ کھلے ہوئے تھے۔ چہرے گول بیضوی تھے۔ برمی عورتوں کی طرح انہوں نے رنگ دار دھوتیوں کے اوپر ریشمی صدریاں پہن رکھی تھیں۔ سیاہ چمکیلے بالوں میں سفید یا سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ بعض عورتوں نے بھڑکیلے رنگوں والی ساڑھیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ ان کے مقابلے میں مرد کمزور اور غیر موثر شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ایک بار پھر اپنا اکلوتا سوٹ کیس باہر نکالا اور ایک شخص کو اٹھانے کو کہا۔ اس نے میری طرف غصے سے دیکھا اور کہا۔

''میں قلی نہیں' ٹکٹ چیکر ہوں۔۔۔۔۔۔ اپنا ٹکٹ دکھاؤ۔''

میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ جلدی سے ٹکٹ نکال کر اسے ٹکٹ دکھایا۔ اس نے ٹکٹ پر پنسل سے نشان لگایا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اب میں کسی قلی کو بلاتے ہوئے ڈر رہا تھا' کیا معلوم وہ سٹیشن ماسٹر نکل آئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک قلی اپنے آپ آگے بڑھا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر مجھے باہر لے آیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا چوک ہے جہاں بجلی کی بسیں اور ٹرامیں اور موٹریں آگے پیچھے بھاگی جا رہی ہیں بارش ہو کے ہٹی تھی۔ لنکا دیش کے باشندے چھتریاں کندھوں پر لٹکائے تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ ایک ٹیکسی والا میرے پاس آ کر انگریزی میں بولا۔ ''ہوٹل چلے گا بابو؟''

یہاں انگریزی اور اردو ساتھ ساتھ بولی جاتی ہے۔ میں نے سوچا' یہاں کوئی واقف کار نہیں ہے' پہلے ہوٹل ہی میں چلنا چاہیے' وہاں جا کر کوئی پکا بندوبست کیا جائے گا۔ چنانچہ میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور سے مل کر اس بات کا پوری طرح اطمینان کر لیا تھا کہ ہوٹل درمیانے درجے کا ہو اور اس کے اخراجات زیادہ نہ ہوں۔ ٹیکسی مجھے کولمبو شہر کی خوبصورت سڑکوں کی سیر کرواتی ہوئی ایک ہوٹل میں لے آئی۔ یہ ہوٹل معمولی سی عمارت میں واقع تھا۔ کئی روز کے سفر کا تھکا ہارا کمرے میں ہی کھانا کھا کر سو گیا اور شام تک سویا رہا۔ شام کو اٹھ کر نہایا' کپڑے بدلے اور شہر کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ کولمبو کی حسین سڑکوں پر روشنی ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی عمارتوں پر بتیاں روشن تھیں اور چراغاں کا گمان ہو رہا تھا۔ میرے راستے میں دو سینما گھر بھی آئے جہاں انگریزی فلموں کی نمائش ہو رہی تھی' جن میں سے ایک فلم ''Reap the Wild Wind'' کا بڑا سا بورڈ لگا تھا۔ دوسرے روز میں پھر سیاحت کو نکلا۔

اب میں لوگوں سے پوچھتا پچھاتا پٹہ کے علاقے میں آ گیا' یہ کولمبو کا کاروباری علاقہ تھا اور لاہور کی اکبری منڈی کی یاد دلاتا تھا۔ اکبری منڈی کی طرح گنجان اور گندہ تھا دراصل یہ کولمبو کا پرانا اور قدیم ترین گنجان آباد علاقہ تھا۔ یہاں میں نے راون کے زمانے کے بت اور کھنڈر دیکھے۔ یہاں بوسیدہ اور تنگ و تاریک عمارتیں تھیں جن کے ایک ایک فلیٹ میں چار چار کنبے آباد تھے۔ شہر کا سارا غلہ اور اجناس یہاں فروخت ہوتا تھا۔ یہاں سبزی منڈی تھی' گھاس منڈی تھی' میوہ منڈی تھی' غلہ منڈی تھی' صرف ہیرا منڈی نہیں تھی' جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ ان ساری منڈیوں پر بھارتی ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ آپ کو یاد ہو گا پچھلے دنوں سیلونی حکومت نے اس کاروباری علاقے پر بھارتی ہندوؤں کی اجارہ داری کو ختم کر دیا تھا اس لیے کہ یہ لوگ وہاں کے عوام کو ایکسپلائٹ کرتے تھے اور ذخیرہ اندوزی' بلیک مارکیٹ وغیرہ میں درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے۔

یہاں میری ملاقات جبار نامی غلے کے ایک تاجر سے ہوئی۔ داڑھی مونچھ صفا چٹ گورے رنگ کا یہ شخص پشاور کا رہنے والا تھا اور کوئی پندرہ برس سے کولمبو میں تجارت کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے کولمبو کی سیاحت کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے اور میں نوکری کرنا چاہتا ہوں تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''کوئی بات نہیں' تم مسلمان ہو' ہم سے جو کچھ ہو سکے گا تمہارے لیے کریں گے۔''

اس نے مجھے اپنی دوکان پر ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر رکھ لیا' ساتھ ہی دکان کے اوپر ایک کمرہ بھی رہنے کو دیا۔ میں نے اسی روز ہوٹل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس اٹھایا اور پٹہ پر آ کر حاجی جبار کی دکان کے اوپر ڈیرہ جما لیا۔ میرا کام سٹور میں جمع ہونے والے مال کی چیکنگ اور بیوپاریوں کو مال حوالے کرتے وقت ان کا پورا پورا حساب رکھنا تھا۔ دوکان میں حاجی جبار کا بہنوئی تجارت میں حصے دار تھا

اور حاجی صاحب کے ساتھ لگی ایک بڑی سی میز پر بیٹھتا تھا۔ یہ کرنجی آنکھوں اور سنہری موچھوں والا بھاری بھر کم آدمی تھا جو سنہرے فریم کی عینک لگاتا تھا۔ حاجی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہے اور انجم تخلص کرتا تھا۔ بڑا باغ و بہار آدمی تھا۔ بیوپاریوں سے بڑی اونچی آواز میں گفتگو کرتا' کاروبار میں ایک بے نیاز رویہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ بیوپاریوں کو اپنے شعر سنا سنا کر خوش کیا کرتا اور کیا مجال جو ایک پائی کا مال زیادہ دے دے۔ حاجی صاحب کا منشی ایک بوڑھا مدراسی مسلمان تھا جس کی داڑھی سفید تھی اور عینک کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی۔

میں صبح آٹھ بجے دوکان کے دفتر میں آ کر کام کرنے لگتا۔ دوپہر تک کام کئے جاتا۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھاتا' شام پانچ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شہر کی آوارہ گردی کو نکل جاتا۔ میں نے ایک مہینے کے اندر اندر کولمبو کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ اس شہر کی نفاست' صفائی' کشادگی اور درختوں کی چھاؤنی نے مجھے بڑا متاثر کیا تھا۔ لیکن باقی شہر بڑا خوبصورت اور دلکش تھا۔ بلند و بالا عمارتیں کشادہ سڑکیں سمندر کا حسین ترین کنارہ۔ ناریلوں اور بانس کے درختوں کے جھنڈ' گال روڈ بڑی کشادہ اور بے حد طویل سڑک تھی۔ یہ سڑک سمندر کے ساتھ ساتھ کئی میل تک چلی گئی تھی۔ حاجی صاحب کی کوٹھی شہر سے باہر ایک پر فضا جگہ پر واقع تھی۔ لان میں ناریل اور سرخ پھولوں والے درخت تھے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی فوجیں مقبوضہ علاقوں میں ابھی تک مقیم تھیں۔ ان کی تفریح طبع کے لیے ریڈیو سیلون سے اردو میں پروگرام نشر ہوتے تھے۔ ایک خوبصورت اتفاق سے میں حاجی صاحب کی دکان سے نکل کر ریڈیو سیلون پہنچ گیا اور میرے سامنے سیلون کے حسین ترین باغوں' کلبوں اور جگمگاتے ڈرائنگ کمروں کا دروازہ کھل گیا۔

◆◆◆

ایلورا کی آنکھیں

ریڈیو سیلون کی دوپہر کی ٹرانسمیشن پورے ایک بجے ختم کر کے گھر آیا۔

آج دو بجے ایلورا سے ملنے جانا تھا۔ ایلورا کولمبو کی ایک پر اسرار لڑکی تھی۔ سانولی' خاموش' ماتھے پر بندیا' سیاہ بالوں میں تر تاری کے سفید پھول اور کانوں میں چمکتے ہوئے کاسنی نگینے۔ میں ایلورا سے ملنے بس میں سوار ہو کر ٹاور برج کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے ایلورا کو سب سے پہلے کولمبو کی ٹمپل روڈ پر چوک والے بدھ مندر کے سامنے ایک مکان کے آنگن میں دیکھا تھا اس کے بالوں میں سفید پھول لگے تھے اور وہ برآمدے میں بانس کی آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی میں ٹرام میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک پل کے لیے اس نے بھی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا ہماری نظریں ملیں اور ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے' ایک پل میں ٹرام آگے نکل گئی اور میں پیچھے رہ گیا' بہت پیچھے۔۔۔۔۔۔۔ ہزاروں سال پرانے ماضی کے نیم روشن جنگلوں میں' جہاں ایلورا بھی تھی اب نہ وہ ٹرام تھی اور نہ وہ آنگن اور نہ وہ بانس کی آرام کرسی۔ یہاں بانس کے گھنے جنگلوں میں سفید پھولوں کے جھنڈ ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ایلورا میرے پاس بیٹھی تھی اور ہم مشرق کی طرف منہ کئے سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

بس نے مجھے ٹاور برج اتار دیا' میں نے گھڑی دیکھی' ابھی ایلورا کے دیدار میں بیس پچیس منٹ باقی تھے۔ کولمبو شہر کی عمارتیں اور پارکوں کے درخت دھوپ میں چمک رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے آنے والے ہوا کے جھونکوں میں نمی تھی۔ چوڑی کشادہ سڑک پر سے زرد اور نیلے رنگ کی دو منزلہ بسیں گزر رہی تھیں۔ میں ریلوے پل پر آ گیا۔ نیچے ریلوے لائن بچھی تھی۔ ڈھلانوں پر تاڑ کے درخت سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ سبز رنگ کی ایک لوکل ٹرین بڑی تیزی سے گزر گئی۔ ایک اینگلو سیلونی خوبصورت لڑکی چھتری لگائے میرے قریب سے گزر گئی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلتا مارکیٹ کی سمت آ گیا' اس مارکیٹ کا نام گارگل تھا اور یہاں دنیا جہان کی چیزیں مل جاتی تھیں۔ اب میری آنکھیں اس بس سٹاپ پر لگی ہوئی تھیں جہاں ٹمپل روڈ والی بس آ کر ٹھہرتی تھی۔ ایلورا کو آنا تھا۔ میں سوچنے لگا ایلورا گھر سے چل پڑی ہوگی' اس کی بس اب میونسپل گارڈن کے سامنے سے گزر رہی ہوگی' اب وہ بوریلا چوک کے جنکشن میں ہوگی اور اب بھلا پٹی کے لوکل سٹیشن کے پاس ہوگی اور اب اچانک میں نے دیکھا' ایک لڑکی ہلکے پیازی رنگ کی ساڑھی پہنے ماتھے پر تلک لگائے فٹ پاتھ پر چلی آ رہی ہے۔ یہ ایلورا تھی' سیلون کی

شہزادی۔

سیلون کا شبنمی پھول!

ہوا میں اس کی ساڑھی کا پلو اڑ رہا تھا جسے وہ بار بار سنبھال رہی تھی۔ ایلورا نے سیاہ بالوں کے جوڑے میں کنول کا سفید پھول سجا رکھا تھا۔ کانوں میں سبز رنگ کے چمکیلے پتھر تھے اور اس کا سانولا رنگ دھوپ میں تمتما رہا تھا۔ ایلورا میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی طرف سے جو ہوا آئی اس میں پرانے حنا کی گرم خوشبو تھی۔ ہم سمندر کی طرف چلنے لگے۔ ہم نے فٹ پاتھ چھوڑ کر ایک کشادہ سڑک عبور کی۔ دوسری سڑک پر فٹ پاتھ پر آ کر پھر ایک چوک میں سے گزرے۔ اب سامنے وہ سڑک تھی جس کے عقب میں خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے سمندروں کے پانی آپس میں گلے مل رہے تھے۔ ہوا میں تیزی آ گئی اور لہروں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ ہم سڑک چھوڑ کر ساحل سمندر پر آ گئے۔ کنارے کنارے ناریلوں اور تاڑ کے جھنڈ دور ماؤنٹ لیونا کلب تک چلے گئے تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا خوبصورت ریستوران تھا۔ سبز رنگ کی میزیں باہر ناریل کے درختوں تلے رکھی تھیں۔ ہم دونوں یہاں بیٹھ گئے۔ سمندر ہم سے کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر تھا۔ پانی کی وسیع و دبیز چادر افق تک پھیلی ہوئی تھی' جس کے اوپر کولمبو کے سبز آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔

ایلورا کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک تھی۔ میں نے کافی منگوائی' ایلورا ناریل کے درختوں میں سے نظر آتے سمندر کی چمکیلی لہریں دیکھ رہی تھی۔ ان لہروں کو سمندر دور سے ساحل کی طرف بھیج کر واپس لیے جا رہا تھا۔ ایلورا مجھے کولمبو کے ماڈرن شہر کی لڑکی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس جدید دور کی لڑکی کبھی نہیں لگی تھی۔ اس کی آواز سن کر اس کی پراسرار آنکھوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ کولمبو کی دو ہزار سالہ پرانی تاریخ کے پردوں میں سے نکل کر باہر آ گئی ہے۔

میں نے سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

''تمہیں جلدی تو نہیں ایلورا؟''

وہ میری طرف دیکھ کر ذرا سی مسکرائی اور بولی۔

''مجھے اپنے سیلون دیس' سنہال دیس کا ایک لوک گیت یاد آ رہا ہے۔''

''سناؤ گی؟''

''تم ہماری سنہالی زبان نہیں سمجھتے' میں تمہیں اس کا ترجمہ سناتی ہوں۔''

ایلورا نے گہرا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر خشک آواز میں بولی۔

''یہ گیت ایک ہرنی کی فریاد ہے' اصل میں یہ ایک سنہالی عورت کی دکھ بھری صدا ہے جس کے دیس پر انگریز حاکموں کا قبضہ

ہے۔''

ایلورا نے مجھے اپنے سنہالی دیس کا لوک گیت سنایا جو یہ تھا۔

ہرن کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہرنی تھک گئی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ ہرن جنگل میں ہرنی کو اکیلا چھوڑ گیا۔ چکر کھا کر ہرنی گر پڑی۔ یہ دکھ سہا نہیں جاتا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔''

''او شکاری! میری بات سن' میرے ہرن کو نہ مارنا' ہماری ڈار سونی ہو جائے گی' کس سمت کے شکاری ہو' کس سمت کو جا رہے ہو' پچھم کی طرف سے آئے ہو' میرے ہرن کو نہ مارنا!

او شکاری! میری بات مان لے...... جب شکاری نے پھندا لگایا' ہرنی کود کر بغل میں جا کھڑی ہوئی۔ ہرنی کا پاؤں پھنس گیا۔ ہرنی کھڑی آنسو بہا رہی ہے او ہرن! میری بات سن لے تو بھی پھندے میں پھنس گیا۔ میرا کیا حال ہو گا!

ہرن کھڑا ہوا یہ سمجھا رہا ہے' ہرنی! میری بات سن لے' شکاری کو میرے گوشت سے اپنے بچوں کا پیٹ بھر لینے دے' وہ غریب ہیں' اس کے بچے بھوکے ہیں۔

شکاری کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ آگے بڑھا' اس نے پھندا کاٹ دیا۔ ہرنی خوشی سے آنسو گرا رہی ہے۔ خدا نے جوڑی ملا دی۔ شکاری نے پھر سے جوڑی ملا دی۔''

لوک گیت ختم ہو گیا۔ ایلورا خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا خوبصورت سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس سے وہ قدیم ماضی کی کوئی دیو داسی معلوم ہو رہی تھی یا وہ ہرنی جس کا ہرن اسے جنگل میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ سمندر کی لہریں دور دور سے آ کر ساحل کو چوم رہی تھیں۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''ایلورا! یہ گیت کہیں تمہارے دکھی دل کی پکار تو نہیں تھی؟''

ایلورا نے آنکھیں کھول دیں اس کی پراسرار آنکھوں میں سورج غروب ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایک پل کو خاموش رہی پھر سانس بھر کر بولی۔

''ہاں شاید میرا ہرن بھی مجھے جنگل میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔''

ایلورا پھر سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم اس جنگل میں آئے ہو نہیں جانتی کہ شکاری بن کر آئے ہو یا ہرن بن کر۔ میری ہزاروں سالوں کی نیند ٹوٹ گئی ہے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے ایلورا' وہم ہے۔''

ایلورا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک حیرت انگیز چمک نمودار ہوئی۔

''ہاں' یہ سب کچھ وہم ہے' سب کچھ وہم ہے تم بھی وہم ہو' میں بھی وہم ہوں۔''

آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ سورج بار بار بادلوں میں چھپ رہا تھا۔ ایلورا خاموشی سے کافی پینے لگی۔ اچانک بادل زور سے گرجا۔ ایلورا نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور بارش کا پہلا قطرہ اس کے ہونٹوں کو چومتا ہوا اس کی ساڑھی پر گر پڑا۔ بارش شروع ہو گئی۔

بارش! بارش! کولمبو کی بارش سیلون کے جنگلوں کی بارش! میں نے ایلورا کا ہاتھ پکڑا اور ہم بھاگ کر ریستوران کے برآمدے میں آ گئے۔ کولمبو میں بارش بڑی تیز ہوتی ہے اور اچانک شروع ہو جاتی ہے۔ ہم کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے چائے منگوائی۔ کیبن کے شیشوں میں سے بارش کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ناریل اور تاڑ کے درخت تیز بارش میں دھل رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے تیز ہوا چلنے لگی۔ ایلورا نے پیالی میں چائے انڈیلی تو کیبن میں سیلونی چائے کی خوشبو میں ایلورا کے جوڑے کے پھول کی خوشبو مل گئی۔

کیبن والے پنکھے کی ہوا میں ایلورا کے بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر لہرانے لگی تھی۔ میں نے سیلونی چائے کا خوشبودار گھونٹ پیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں گلاب کا پودا ہوں اور میرے سارے بدن پر گلاب کے پھول کھل اٹھے ہیں۔ میں نے سینئر سروس کا بہترین سگریٹ سلگایا۔ کولمبو کے سمندر کا ساحل۔ بارش' سیلون کی چائے اور ایلورا کے جوڑے میں کانپتا ہوا کنول کا پھول۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ایلورا سے کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو' یہ وہم ہے سب کچھ وہم ہے۔ میں' تم' بارش' سمندر' چائے' سگریٹ' یہ سب کچھ وہم ہے۔''

ایلورا نے چائے کا پیالہ میز پر رکھا اور پرس میں سے ننھا سا ریشمی رومال نکال کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

''ہزاروں سال پہلے اس جزیرے کے جنگلوں میں سبز پانیوں کے ندیاں بہتی تھی۔ انہی جنگلوں میں ایک ہرنی اور ہرن کہیں سے آ نکلے۔ مہوا کے درخت تلے انہوں نے اپنا گھر بنا لیا اور ہرن میری بات مان لے' ادھر مت جانا' ادھر شکاری نے پھندا لگایا ہے پر ہرن ادھر چلا گیا اور پھر ہرنی آنسو بہاتی چلی گئی۔''

ایلورا نے آنکھیں بند کر لیں۔ ننھا ریشمی رومال اس کی بند مٹھی میں سمٹ گیا اور باہر ناریل کے درختوں میں بارش تیز ہو گئی۔

◆◆◆

بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ

ساتویں تاریخ رمضان کو شام کے وقت میں اور میرا بھائی امراء میرزا انور گھر سے روزہ بہلانے کے واسطے جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر گزری کی سیر کر کے گھر کو واپس آنے لگے تو وقت تنگ ہو گیا تھا۔ میں نے بھائی سے کہا کہ چلو مینا محل میں چل کر روزہ کھولیں گے۔ میں اپنی سسرال میں گیا' پہرے والوں نے اندر اطلاع کی۔ گھر میں مبارک خادمہ نے کہا' میاں آتے کیوں نہیں تم سے چھپنے والا کون ہے۔ تمہاری خوشدامن ہے اور باقی سب بڑی بیگم صاحبہ کے ہمراہ بخشی جی کی شادی میں مہمان گئے ہیں۔ نواب صاحب اور تمہاری بھابو ہیں۔ میں نے کہا' میرا چھوٹا بھائی میرے ساتھ ہے' تم پردہ کر دو۔ غرضیکہ وہ دالان میں چلی گئی' چلمنیں چھوٹ گئیں' پردہ ہو گیا۔ باہر مکان کے صحن میں بنگلے کے آگے تختوں کا فرش تھا۔ وہاں نواب صاحب میرے خسر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اور میرے بھائی نے آگے بڑھ کر آداب کیا۔ فرمایا' آؤ بیٹا' بیٹھ جاؤ۔ میں ہنوز بیٹھا ہی ہوں اور میرا بھائی میری برابری میں ہے کہ یکایک روزے کی توپ کی آواز آئی۔ روزہ افطار کر کے نماز پڑھی گئی۔ پھر کھانے کا دسترخوان بچھا کھانا کھانے بیٹھے' دو لقمے کھا کر میرے خسر مجھ سے فرمانے لگے بھئی' نواب میرزا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں تلوار چلے اور خونریزی عظیم ہو میں نے عرض کی۔ حضرت آپ بزرگ ہیں آپ یوں ہی فرمایا کرتے ہیں۔ شہر میں تلوار چلنے کے کون سے آثار ہیں۔

نواب صاحب: بیٹا کیا تم میری بات کو خلاف جانتے ہو' خدا کی قسم ایسا امر ہونے والا ہے۔

جب تو مجھے یقین ہوا کہ ان کی بات کبھی خلاف نہیں ہوتی میں نے پوچھا' کیا روس کی فوج آئے گی۔

نواب صاحب: اس کا علم اللہ کو ہے۔

پھر جب میں نے پوچھا' حضرت یہ امر کب تک ہونے والا ہے۔

نواب صاحب: کہنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے اسی رمضان میں ہو جائے اور بھئی دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ میں شہید ہوں گا۔

میں نے عرض کی۔ حضرت خدا کے لیے یہ تو نہ فرمائیے' خدا آپ کو ہمارے سر پر زندہ اور سلامت رکھے آپ ہماری سپر ہیں۔

نواب صاحب: مشیت ایزدی سے کچھ چارہ نہیں۔

القصہ۔۔۔۔۔۔ہم دونوں بھائی کھانا اور پان کھا کر رخصت لے کر اپنے گھر آئے۔

یہ اقتباس استاد ذوق کے شاگرد اور ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی ظفر آخری شاہ دلی کے داروغہ ماہی مراتب سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب کا عنوان ''داستان غدر'' اس لیے رکھا کہ وہ شاہ پسند تھے۔ دلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی مصاجت میں تھے لیکن مجھے اس وقت ان کی شاہ پسندی یا شاہی مصاجت سے بحث نہیں کرنی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں سید ظہیر دہلوی نے آج سے ایک صدی پہلے کی دلی کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ یہ جھلک اس قدر جامع اور بھرپور ہے کہ سو برس پہلے کی دلی کی مسلم معاشرت کے سارے رنگ' ساری خوشبوئیں' سارے آداب اور وضع داریاں اس میں موجود ہیں۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے جب میں ان صفحات پر پہنچا تو مجھے کتاب میں دلی کا دل دھڑکتا محسوس ہوا' الفاظ غائب ہو گئے اور ان کی جگہ کردار چلتے پھرتے نظر آنے لگے اور میں سید ظہیر دہلوی اور اس کے بھائی امراؤ میرزا کے ساتھ ہی ان کے خسر کی حویلی میں داخل ہو گیا۔ آج یہ حویلی اجڑ چکی ہے اگر کھنڈر بن کر اس نے دلی کے انمول کھنڈرات کے قیمتی خزانے میں اضافہ نہیں کیا تو پھر وہ یقیناً لائلپور اور سرگودھا کے ہندو ساہوکار شرنارتھیوں کے قبضے میں ہوگی اور اس کے پردوں کی حیادار چلمن اتر گئی ہوگی۔ اب کسی کے آنے پر پردہ نہیں ہوتا ہوگا۔ دیواروں پر مغلئی بیل بوٹے کی جگہ چولہوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی کالک لگی ہوگی اور طاقچوں میں کتابت شدہ قرآن حکیم کے نسخوں کی جگہ بہی کھاتے رکھے ہوں گے۔

کنہیا لال کپور نے اپنے ایک مزاحیہ مضمون میں لکھا تھا کہ دلی کی ہر اینٹ کے نیچے ایک بادشاہ دفن ہے۔ میں نے دلی کی ہر اینٹ کے نیچے جھانک کر نہیں دیکھا لیکن ہر اینٹ پر اسلامی ثقافت اور دلی کی مسلم کلچر کی مہر ضرور ثبت دیکھی ہے۔ میں نے دلی سے پیار کیا ہے' اس کے باغوں' گھنے سایوں والے نیم کے درختوں' پرانی بارہ دریوں' کشادہ صحن مسجدوں' اگر بتیوں' گلاب کے پھولوں کی خوشبوؤں سے مہکتے مزاروں اور پراسرار تاریخی گلی کوچوں سے پیار کیا ہے میں ان کی زبان میں ان کے کلچر اور ثقافت کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ لیکن اپنی زبان میں ان کے کلچر اور ثقافت سے اپنی محبت کا اظہار ضرور کر سکتا ہوں دلی کی زبان غلط لکھ سکتا ہوں مگر اپنی زبان کبھی غلط نہیں لکھ سکتا اس لیے کہ یہ محبت کی زبان ہے اور محبت کی ہر زبان صحیح ہوتی ہے۔

اب میں نے ہوش سنبھال لی تھی چنانچہ ایک بار کلکتہ جاتے ہوئے دلی اتر گیا۔ میں جامع مسجد کے قریب اپنے ایک امرتسری دوست کے مکان میں ٹھہرا۔ میرا دوست ریلوے میں ملازم تھا' وہ دفتر چلا جاتا اور میں دلی شہر کی آوارہ گردی کو نکل کھڑا ہوتا۔

ایک روز میں جنتر منتر کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا جا کر بیٹھ گیا' میں نے سگریٹ سلگایا اور سڑک پر گزرتی گاڑیوں اور دلی والوں کو

دیکھنے لگا۔ بائیں ہاتھ کو ذرا فاصلے پر مجھے ایک کوٹھی کے صحن میں نیم کا درخت نظر آیا۔ لکڑی کا ایک تخت بچھا تھا۔ ایک عورت بیٹھی ترکاری بنا رہی تھی۔ ایک بچی گیند سے کھیل رہی تھی۔ دوسری کوٹھی کے صحن میں ململ کے سفید کرتہ پاجامہ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر بزرگ آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجھے سارے شہر میں ایک سکون' امن' خوشی وقتی اور ایک قسم کی رومانٹک فراغت کا احساس ہوا۔

قطب صاحب کی نیم روشن سنگ سرخ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے شہنشاہ ہمایوں کا خیال آ گیا' جس نے انہی سیڑھیوں پر گر کر اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کی تھی۔ قطب صاحب کی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا۔ میں نے جنگلے پر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ درخت جھاڑیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میرے قریب ہی ایک برقع پوش خاتون اپنے میاں کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ میاں اسے قطب صاحب کی لاٹھ کی تاریخ بتا رہا تھا اور وہ یوں سہمی سی کھڑی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہیں میاں نیچے دھکا نہ دے ڈالے۔

ایک روز میں دلی کے لال قلعہ کی سیر کو نکل گیا۔ ٹکٹ لے کر میں قلعے کے عظیم الشان دروازے میں داخل ہو گیا۔ اب میں ایک چھتے ہوئے بازار میں تھا جو آگے چل کر بائیں طرف گھوم گیا تھا۔ بازار میں دونوں جانب ہینڈی کرافٹ اور نوادرات فروخت کرنے والوں کی دوکانیں تھیں۔ بازار ختم ہوا تو قلعے کے باغات اور محلات کے تختے شروع ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے عروج کا زمانہ تھا۔ جگہ جگہ بارہ دریوں کے آس پاس ریت کی بوریاں رکھی تھیں۔ گھاس کے تختوں میں گلاب کے پھولوں کے جھاڑ مسکرا رہے تھے۔ چلتے چلتے میں ایک اونچی چھت والے دیوان میں آ گیا یہاں دیواروں پر اور لکڑی کے سٹینڈوں پر شیشے کے فریموں میں جڑی ہوئی تصویریں لگی تھیں' جن میں جنگ آزادی کے مختلف مناظر دکھائے گئے تھے۔ ٹکٹکیاں لگی ہیں' جنگ آزادی کے متوالوں کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں' انہیں کوڑے لگائے جا رہے ہیں' انہیں تختہ دار پر کھینچا جا رہا ہے۔ کشمیری دروازے کے تاریخی مورچے پر انگریزی فوج گولہ باری کر رہی ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان تصویروں میں انگریزوں نے جنگ آزادی کے مجاہدوں کو انگریز عورتوں اور بچوں پر ظلم کرتے بہت دکھایا تھا۔ انگریز فوج نے دلی شہر میں داخل ہو کر جو بہیمانہ قتل عام کیا اس کی ایک تصویر بھی وہاں نہیں تھی۔

اس یک طرفہ تصویری نمائش گاہ سے نکل کر میں ایک روش پر سے ہوتا ہوا دیوان خاص میں آ گیا یہاں سنگ مرمر کا ایک تخت بچھا تھا۔ قریب ہی ایک گائیڈ سیاحوں کو بتا رہا تھا کہ یہاں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر بیٹھ کر دربار کیا کرتا تھا۔ میں نے دیوان خاص کے مرمریں ستونوں اور نیم منقش چھتوں کو دیکھا۔ کبھی یہاں دیباؤ کمخواب کے بیش قیمت پردے کھنچے ہوں گے' سنگ سرخ کا فرش ایران

وکاشان کے دبیز ریشمی قالینوں سے ڈھکا ہوتا ہوگا۔ یہ سنگ مرمر کا تخت' تخت طاؤس کو مات کرتا ہوگا' جن غلام گردشوں کے ننگے فرش پر آج سیاہ گرد آلود جوتے لیے تصویریں اتارتے پھر رہے تھے وہاں کبھی زربفت کے پردوں کے ٹھنڈے سایوں میں خرطوم وسوڈان کے خواجہ سرا دبے پاؤں چلتے ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔لیکن آج ان غلام گردشوں میں سوائے عبرت کے اور کچھ نہ تھا۔ فرش ننگے تھے' سنگ مرمر کا تخت ٹھنڈا اور عریاں تھا۔ دیوان خاص پر کھینچے ہوئے دیبا و کمخواب کے پردے نوچ لیے گئے تھے۔ کشمیری گیٹ کے تاریخی مورچے کو ختم کرنے کے بعد انگریزوں نے اپنا جھنڈا لہرا دیا تھا اور قطب صاحب کی سیڑھیوں میں سلطنت مغلیہ کا شہنشاہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

اب میں ان خستہ نیم روشن حماموں میں تھا جہاں شہزادیاں غسل کیا کرتی تھیں' جہاں چونے اور کلر کی بوجھل بو پھیلی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ کو پائیں باغ میں ایک سفید سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد نظر آئی' ایسے لگا جیسے کسی نے کوزہ مصری سے مسجد کا ماڈل بنا کر درختوں کے بیچ میں رکھ دیا ہو۔ یہ موتی مسجد تھی۔ دیواروں پر رنگین بیل بوٹوں کے نقش تھے اور قرآنی آیات لکھی تھیں۔ ایک صاحب ململ کی ٹوپی پہنے نماز پڑھ رہے تھے۔ چاروں طرف نیم روشن ٹھنڈک سے پھیلی ہوئے تھی اور اس ٹھنڈی نیم روشن فضا میں مولسری کے سائے بھی تھے اور چنبیلی کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی رچی تھی۔

دلی کو آخری بار میں نے کولمبو سے واپس آتے ہوئے دیکھا۔ ۱۹۴۷ء کے شروع اگست کا زمانہ تھا۔ چاروں طرف فسادات کی ہولناک آگ بھڑک رہی تھی۔ فضائیں انسانی چیخوں' گولیوں' بموں کے دھماکوں اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھیں۔ دھنش کوڈی سے ٹرین پر سوار ہوا اور مرورا' رامیشورم' مدراس' ناگپور سے ہوتا ہوا دلی پہنچا۔ کوئی ریلوے سٹیشن ایسا نہیں تھا جہاں مسلمان بے یار و مددگار کسمپرسی کے عالم میں نہ پڑے ہوں۔ دلی ایک بار پھر اجڑ رہی تھی۔ اس کا آسمان دھواں دھواں تھا۔ ہوا میں مٹی کا تیل' پٹرول اور جلی ہوئی لکڑیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر رات کرفیو لگ جاتا تھا۔ مسجد فتح پوریکری کے سامنے سے گزرا تو وہاں ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کل یہاں ہندوؤں نے بم پھینکا تھا جس سے کچھ نمازی شہید اور زخمی ہوئے۔ سامنے والی کتابوں کی دکان بند تھی۔ میں بازاروں میں پیدل چلتا دکانوں' مکانوں' ان کے دروازوں' کھڑکیوں پر گری چلمنوں اور کہیں کہیں جھانکتے سہمے ہوئے چہروں کو دیکھتا۔ ریلوے سٹیشن کے سامنے آ گیا۔ باغ میں کچھ لوگ بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ دلی ریلوے سٹیشن کی قلعہ نما عمارت پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ہندو سکھ شرنارتھیوں سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں چلی آ رہی تھیں اور یہ شرنارتھی ہر طرف افواہوں کا زہر پھیلا رہے تھے۔ میں نے پنجاب میں دلی سے امرتسر تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور ڈبے میں سوار ہو گیا۔

اندر داخل ہو کر ایک طرف دیکھا تو سامنے سیف الدین سیف بیٹھے تھے۔ وہ بھی دلی سے امرتسر جا رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد انجن نے وسل دیا اور گاڑی دلی سٹیشن کو پیچھے چھوڑتی لال قلعہ' تاج محل' قطب صاحب' بازار چتلی قبر' جامع مسجد اور بائیس خواجاؤں کی مقدس چوکھٹ کو پیچھے چھوڑتی امرتسر کی طرف چل پڑی۔ بائیں جانب ایک بازار نظر آیا۔ سڑک پر ہلکی ہلکی گرد اڑ رہی تھی۔ ایک تانگہ جا رہا تھا۔ ایک دکاندار گدی پر بیٹھا گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ دلی کی آخری جھلک تھی۔ دلی جو عالم میں انتخاب شہر تھا' جو کئی بار اجڑی' کئی بار بسی۔

یہ شہر وہ ہے غنچہ تھا مہ جمالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مجمع تھا حسن والوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا باکمالوں کا
یہ وہ مکان ہے مکیں جس کے قیصر و جم تھے
یہ خطہ وہ ہے گدا جس کے فخر خاتم تھے
یہ وہ زمین ہے زمیں جس کی زر اگلتی ہے
یہ وہ خاک ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

◆◆◆

وہ کون تھی

ایلورا نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ منگل وار کو فون کرے گی۔

منگل وار کو دن بھر اس کے ٹیلی فون کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے دفتر سے سٹوڈیو میں جاتا تو کہہ جاتا کہ میرا فون آئے تو مجھے فوراً بلا لیا جائے۔ لیکن پراسرار آنکھوں والی سنہالی لڑکی کا فون نہ آیا۔ وہ دن گزر گیا' دوسرا بھی گزر گیا۔ مجھے بڑی تشویش ہوئی کیونکہ ایلورا وعدے کی بڑی پابند تھی۔ شام کو میں ٹمپل روڈ پر ایلورا کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ سوچا شاید وہ کولمبو سے باہر گئی ہو' لیکن مکان میں روشنی ہو رہی تھی یعنی وہ گھر پر ہی تھی۔ پھر اس نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ میں وہاں سے سیدھا چوک والے بدھ مندر میں آ گیا۔ اسی مندر کے صحن میں' میں ایلورا سے پہلی بار ملا تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر عورتیں ٹوکریوں میں رکھے پھول بیچ رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں ایلورا سے پہلی ملاقات کی تصویر گھوم گئی۔

کولمبو کی وہ شام بڑی حسین تھی۔

ایلورا اس بدھ مندر میں مجھے ملنے آ رہی تھی۔ میں نے سفید کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر میں نے کنول کے پھول خریدے اور مندر میں آ گیا۔ یہ مندر پرانا اور خوبصورت تھا۔ ایک بڑے ہال کمرے میں گوتم بدھ کی کئی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں کانسی کا ایک بہت بڑا بت تھا جو بجلی کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ بت کی آنکھوں میں دو سبز رنگ کے پتھر چمک رہے تھے۔ بدھ کے چہرے پر جلال اور سکون تھا۔ گوتم بڑا عظیم انسان تھا اس نے غریب کے دکھ درد کو محسوس کیا اور اس کی خاطر محل کے عیش و آرام کو چھوڑ' اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا۔ پجاری گوتم بدھ کے مجسمے کو سجدے کر رہے تھے اور میری نگاہیں اپنی سانولی پراسرار آنکھوں والی محبوبہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مندر میں ہر قسم کی عورتیں موجود تھیں۔ مگر ایلورا کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگانا چاہا مگر مندر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ موٹی توند والے مہنت کے اشلوک پڑھنے کی آواز میرے کان میں آ رہی تھی۔ اب کچھ عورتوں نے سنہالی زبان میں گوتم بدھ کی تعریف میں بھجن گانے شروع کر دیئے۔ مندر کی فضا اگربتیوں' لوبان' پھولوں اور جوان عورتوں کے صحت مند پسینے کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔

میں مندر کے صحن میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ میں ایلورا کے آنے سے

مایوس ہو گیا۔ اب وہ لڑکی نہیں آئے گی۔ میں اداس ہو کر مندر کی سیڑھیوں کی جانب آ گیا۔ ابھی میں پہلے چبوترے پر ہی تھا کہ میں نے ایلورا کو دیکھا' وہ کانسی کی تھالی میں لوبان سلگائے پھول رکھے سفید ساڑھی کا پلو سمیٹے آہستہ آہستہ مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ سیاہ بال اس کی گردن سے ہو کر داہنی جانب سینے پر پھیلے تھے۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ چبوترے پر آ کر ایلورا نے مجھے دیکھا' اس کی پراسرار سیاہ آنکھوں میں کاجل لگا تھا۔ اس کی بڑی بڑی پلکیں مصنوعی نہیں تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے آنکھیں جھکا لیں اور خاموشی سے مندر کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ ایلورا نے گوتم بدھ کے چرنوں میں پھول رکھے اگربتیاں اور لوبان سلگایا' ماتھا ٹیکا اور چھوٹی مورتیوں کے گرد چکر لگانے لگی۔ میں صحن میں آ کر ستون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ایلورا دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور صحن کے عقبی حصے کی جانب چل دی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اب وہ مندر کے برآمدے میں سے گزر رہی تھی۔ اس کے بالوں میں لگے سفید پھولوں اور جسم سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں اس کے قریب ہو گیا۔ ایلورا ایک بدھی بھکشو کے چھوٹے سے مجسمے کے چرنوں میں پھول رکھنے کے لیے جھکی۔ اس نے مجھے اپنے قریب دیکھ لیا تھا۔ ایلورا کا سانولا رنگ سلگ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے موتی تھے۔ میں نے جھک کر اس کی کانسی کی تھالی میں سے ایک پھول اٹھایا اور ایلورا کے بالوں میں اڑس دیا۔ وہ شرما گئی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور آگے چل دی۔ اب ہم جہاں سے گزر رہے تھے' وہاں روشنیاں کم تھیں اور ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے ایلورا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اس نے ہلکی سی سسکی بھری اور رک گئی۔ میں نے پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

میرے اس سوال پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں اجنتا کے غاروں کی گہرائیاں جھانک رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ان گنت صدیوں کے دبیز دھندلکوں میں سے دیکھ رہا ہے۔ وقت کا چکر ایک بار رک کر پیچھے کی طرف چلنا شروع ہو گیا تھا۔ انجانے چہرے دکھائی دے رہے تھے' ان سنی باتیں سنائی دے رہی تھیں' ان کہی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں خاموش کھڑا تھا۔ ایلورا نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا۔

''میں نے ٹرام میں بیٹھے تمہیں دیکھا تھا۔ تم اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ تم نے بھی مجھے دیکھا تھا نا۔''

ایلورا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

ایلورا نے نظریں اٹھائیں اور خواب انگیز آواز میں آہستہ سے بولی۔

''ایلورا''

اس نام میں ہزاروں سالہ تہذیب دفن تھی۔ پرانے مندروں کے کھنڈروں میں اگے ہوئے جنگلی پھولوں کی مہک تھی۔ قدیم عبادت گاہوں کی گھنٹیوں کی صدا تھی۔ میں نے کہا۔

''ایلورا! تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔۔۔۔۔۔کیا تمہیں بھی کچھ یاد آ رہا ہے؟''

اس نے گہرا سانس لیا' درختوں کو گھور کر دیکھا اور بولی۔

''میں جاتی ہوں۔''

میں نے جلدی سے کہا۔

''پھر کب درشن ہوں گے ایلورا؟''

''نہیں معلوم''

''ایسا نہ کہو ایلورا' میں تم سے ملنا چاہتا ہوں' بار بار ملنا چاہتا ہوں' تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم پہلے کہاں تھی' اس کے بعد کہاں ہوگی' ہم پھر کب ملیں گے' کہاں ملیں گے۔''

ایلورا چپ چاپ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے براؤن ہونٹوں پر ہلکا ہلکا پسینہ آیا ہوا تھا۔ کانوں میں چمکتے سبز پتھر تھے۔ نیم وا آنکھوں میں تجسس اور اداسی تھی۔ میں خاموش ہوا تو ایلورا کی سحر انگیز آواز سنائی دی۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟''

''پنجاب سے۔''

''کیا۔۔۔۔۔۔کیا ہندو ہو؟''

''نہیں' مسلمان ہوں۔''

ایلورا نے گہرا سانس بھر کر سر جھکا لیا' اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔

''شدنی ہو کر رہتی ہے۔''

ایلورا ایک سائے کی طرح برآمدوں میں سے گزرتی مندر کی سیڑھیوں کی جانب چل دی اور پھر سیڑھیاں اترتی میری نظروں سے

اوجھل ہوگئی۔ اب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ مندر سے نکل کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جیب سے سینئر سروس کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا' تمباکو کی وکٹورین دور کی مہک نے مجھ پر ایک کیفیت طاری کر دی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ہزار برس پہلے کا انسان ہوں اور تاریخ کے اوراق سے نکل کر کولمبو کی سڑکوں پر آ گیا ہوں۔

ایلورا سے پہلی ملاقات کی خوبصورت یادیں میرے ذہن میں جھلملانے لگی تھیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں ایلورا کے مکان کے دروازے پر جا کھڑا ہوا اور گھنٹی بجا دی۔ دوسری گھنٹی پر ایک کالی سی نوعمر لڑکی نے دروازہ کھولا' میں نے کہا۔ ''اپنے ڈیڈی کو بلاؤ۔''

لڑکی مسکرا کر اندر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کالا سا دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی نمودار ہوا۔ وہ کرتے پاجامے میں تھا' آنکھوں پر سنہری فریم والی عینک چڑھی تھی۔ یہ ایلورا کا ڈیڈی تھا۔ میں نے کہا۔

''معاف کیجئے گا' میں ریڈیو سیلون کا نمائندہ ہوں۔ ہم اپنے پروگراموں کی پسند ناپسند کے بارے میں ایک سروے کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں۔۔۔۔۔۔''

میری آنکھیں ایلورا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے اسی گھر کے صحن میں اسے آرام کرسی پر نیم دراز کتاب پڑھتے دیکھا تھا۔ صحن میں وہی آرام کرسی مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن ایلورا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں جب یہ پوچھا کہ اس کے بچے کتنے ہیں تو ایلورا کے ڈیڈی نے آہ بھر کر کہا۔

''میری کوئی اولاد نہیں' یہ بچی میں نے لے کر پالی ہے۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کوئی بڑی لڑکی بھی نہیں؟''

''جی نہیں''

''او۔۔۔۔۔۔وہ ایلورا؟''

''کون ایلورا؟''

''وہی جو یہاں رہتی تھی جو اس مکان کے آنگن میں آرام کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھا کرتی تھی۔''

ادھیڑ عمر کا وہ مدراسی مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ مجھے پاگل سمجھ رہا تھا۔ میں مکان سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا تو کیا ایلورا یہاں نہیں رہتی؟

کیا وہ کہیں بھی نہیں رہتی؟

میں بدھی مندر میں آ گیا۔ گوم بدھ کا مجسمہ خاموش تھا جیسے ایلورا کے بالوں اس کے سانسوں کی مہک ابھی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں جگمگاتا ہوا سبز پتھر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ میں رات بھر جاگتا رہا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں میں آ گیا' جہاں ہم نے ایک روز چائے پی تھی۔ ایلورا میرے سامنے بیٹھی تھی اور سمندر کنارے کی ہوا میں اس کی سیاہ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

میرے پیارے درختو! تم نے اسے دیکھا ہے؟ اس کے کانوں میں سبز پتھر تھے' بالوں میں سفید پھول تھے' آنکھوں میں آنسو تھے۔۔۔۔۔۔ تم نے اسے دیکھا ہے؟ وہ شام کے اندھیروں میں سمندر کی طرف جا رہی تھی۔

درختوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سبز سمندر کی لہریں دور دور سے آ کر کولمبو کے ساحل کا منہ چوم رہی تھیں۔

◆◆◆

بارش اور ٹی ہاؤس

پاک ٹی ہاؤس میں ہم نے زندگی کا بڑا یادگار دور گزارا ہے' بارہ چودہ برس تک۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک اس ٹی ہاؤس میں ہم دوست مسلسل صبح سے شام تک بیٹھے رہتے ہیں۔ میں' ناصر کاظمی' اشفاق احمد' نواز' احمد بشیر' اختر عکسی' احمد راہی' ظہیر کاشمیری' حمید اختر' انتظار حسین' قیوم نظر' انجم رومانی' شہرت بخاری' عارف عبدالمتین' انور جلال شمزا' انور سجاد' منیر نیازی' سجاد رضوی' کمال احمد رضوی' اعجاز بٹالوی اور دوسرے دوست صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک ٹی ہاؤس میں اپنی سرگرم اور دلچسپ ادبی محفلیں برپا رکھتے۔ قیام پاکستان کے بعد ہم میں سے اکثر پہلی بار اسی ٹی ہاؤس میں ملے تھے۔ ہم بھارت سے لٹ لٹا کر بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان آئے تھے۔ لیکن ہمارے چہرے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ چمک رہے تھے۔ ہم نوجوان تھے۔ ناصر کاظمی دن بھر ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں دن بھر گرما گرم بحثیں کرنے اور ساری رات ریلوے سٹیشن' مال اور میکلوڈ روڈ کی خاک چھاننے کے بعد اگلے روز یہ شعر سناتا۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

تو اہل مجلس جھوم اٹھتے۔ یہی حال منیر نیازی کا تھا۔ اردو نظم اور غزل میں وہ ایک نیا اسلوب لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں لاہور شہر کی سڑکوں پر اکٹھے آوارہ گردی کرتے۔ ساری ساری رات اندرون شہر کی تنگ و تاریک گلیوں اور سڑکوں پر سگریٹ سلگائے نئی نئی غزلوں' نئے نئے افسانوں کی تلاش میں پھرا کرتے۔ انہی شب زندہ داریوں اور کوچہ گردی کے دوران میرے ذہن میں "منزل منزل" "راون کے دیس میں" اور "زرد گلاب" افسانوں نے جنم لیا۔

اب میں پاک ٹی ہاؤس نہیں جاتا۔ ہم میں سے اکثر دوست نہیں جاتے۔ لیکن انتظار حسین' سجاد باقر وی اور انور سجاد کی وضع داری قائم ہے۔ یہ پرانی روایات کو نبھا رہے ہیں۔

آج سے بیس اکیس برس پہلے پاک ٹی ہاؤس میں ہم شاعروں' افسانہ نگاروں اور نقادوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ ان کی صورتیں اور حرکتیں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں ایک موٹی سیاہ گردن والا تو ندیل کاروباری بھی تھا جو

لوہے کا بزنس کرتا تھا۔ یہ موٹا بھدا شخص دروازے کے ساتھ والی میز پر آ کر بیٹھ جاتا اور کوئی نہ کوئی فائل دیکھتے ہوئے چائے پیا کرتا۔ بعد میں اس شخص نے گورنمنٹ کالج کی اس حسین ترین آہو چشم لڑکی سے شادی کر لی جس پر ہم سب شاعر ادیب مرمٹے تھے۔ کوئی ایک برس ہوا میں نے اس کاروباری شخص کو معہ اپنی ایک درجن اولاد کے شیزان کے باہر گاڑی میں دیکھا۔ آہو چشم لڑکی اب طوطا چشم بھاری عورت میں بدل چکی تھی۔

ایسے مہمان بھی تھے جو اپنے پریشان میزبان کے ساتھ ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے۔ ایسے شاعر بھی تھے جو انتہائی خوشخطی سے بل پر دستخط کرتے۔ ایسے گاہک بھی تھے جو کھاتے کم اور باتیں زیادہ کرتے۔ ایسے بھی لوگ تھے جو جتنی دیر ٹی ہاؤس میں بیٹھتے صرف کھاتے رہتے اور کھانا ختم ہو جاتا تو ڈکار مار کر بل ادا کرتے اور چلے جاتے۔ ایک ادھیڑ عمر عینک پوش بزرگ تھے جو ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے ہی ساری میزوں پر سے اخباریں اکٹھی کرتے اور پھر کسی کونے میں بیٹھ کر دیر تک انہیں پڑھا کرتے۔ بیرا ان کی گود میں رکھے اخبارات میں سے کوئی اخبار کھسکانے لگتا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک دیتے۔

ناٹے قد کے گول مٹول سے کلاہ پوش ایک ٹھیکیدار صاحب تھے جو عموماً شام کو آتے۔ جیپ باہر کھڑی کر کے اپنے ملازم کے ساتھ ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے اور درمیان والی میز پر بیٹھتے ہی پہلا کام یہ کرتے کہ گلے میں سے پستول اتار کر کرسی کے ساتھ لٹکا دیتے۔

ان ہی دنوں کی صورتوں میں سے ایک صورت اینگلو پاکستانی کی بھی ہے۔ یہ اونچا لمبا زردی مائل ادھیڑ کا تھا۔ بڑی خاموشی سے کرسی پر بیٹھا پائپ پیتا رہتا۔ دوپہر کا کھانا ٹی ہاؤس میں کھانا کھانے کے بعد وہ دیر تک بیٹھا پائپ کے کش لگاتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی پیتا رہتا۔ وہ مسلسل آٹھ نو برس تک ٹی ہاؤس میں آتا رہا اور پھر ایک روز غائب ہو گیا۔

ایک بڑے مشہور شاعر نے کسی نئے نئے پبلشر سے ماہنامہ نکالنے کے لیے دو سو روپے ایڈوانس لے لیے۔ پرچہ بھلا وہ کہاں نکالتے' پیسے کھا گئے۔ وہ پبلشر دوسرے تیسرے دن ان شاعر کے پاس اپنی رقم کا تقاضا لے کر آتا اور تازہ ترین کلام سن کر جھومتا ہوا واپس چلا جاتا۔

ایک اور صاحب تھے' نام ان کا بھول گیا ہوں' صرف شکل یاد ہے ۔۔۔۔۔۔۔ گول مٹول' نرم و نازک زنانہ چہرہ تھا' پہلے انشورنس ایجنٹ تھے پھر گھر بیٹھے بیٹھے غالباً اکنامکس کا ایم اے کر لیا اور لیکچرار ہو گئے۔ ادیبوں کی محفل میں بیٹھنے کا انہیں بہت شوق تھا۔ قدم ادب اور موسیقی میں اپنی بڑی واقفیت جتاتے۔ اپنے بڑے لڑکے کی علمیت پر بڑا ناز تھا۔ ایک روز کہنے لگے۔

''لو جی' رات میرے لڑکے نے ریڈیو پر علامہ اقبال کی نظم کی غلطی پکڑ لی۔''

میرا خیال ہے کہ شاید قیوم نظر نے جواب میں کہا۔

''وہ غلطی اقبال کی نہیں بلکہ ریڈیو پاکستان کی ہو گی۔''

پاکستان ٹی ہاؤس کے زمانے میں ایک شخصیت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ یہ ایک مولوی صاحب تھے۔ میرا معمول تھا کہ منہ اندھیرے مصری شاہ والے مکان سے نکل کر شاد باغ والے کھیتوں کی ایک مسجد کے باغ میں خوب مالش کر کے ورزش کرتا' مسجد کے سقاوے میں نہاتا' گھر آ کر کپڑے بدلتا' سیر دہی اور آدھ سیر دودھ کا ادھڑ کا پیتا اور سید حانواز کے گھر گوالمنڈی آ جاتا۔ یہاں نواز میرے لیے گلی کی نکڑ والے حلوائی سے پاؤ دہی کی مزید لسی منگواتا اس حلوائی کا دہی بہت میٹھا ہوتا۔ پھر ہم دونوں میو ہسپتال والے باغ میں سے ہو کر ٹی ہاؤس آ جاتے۔ اس وقت یہ مولوی صاحب ٹی ہاؤس کے اندر اگر بتی لگائے ایک میز پر قرآن کریم رکھے تلاوت کر رہے ہوتے۔ تلاوت کرنے کے بعد وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے اور ارد گرد پھونک مارتے اور سراج صاحب کو سلام علیک کر کے باہر نکل جاتے۔

مجھے یاد ہے ہماری ٹولی میں ایک دبلا پتلا لڑکا بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا نام نور تھا۔ سرخ و سفید رنگت' سیاہ بال' شاید وہ پی آئی اے میں ملازم تھا۔ کانونٹ کا پڑھا ہوا تھا۔ انگریزی روانی سے بولتا۔ مصوری اور ادب سے بڑا لگاؤ تھا۔ کوئی نہ کوئی کتاب ہر وقت بغل میں رہتی۔ چھاؤنی سے ٹی ہاؤس اکثر پیدل چل کر آیا کرتا۔ جس روز اس کی جیب گرم ہوتی وہ سارے پیسے دوستوں میں خرچ کر کے آخری سگریٹ سلگا کر اٹھتا اور کتاب بغل میں دبا کر پیدل ہی لاہور چھاؤنی کی طرف روانہ ہو جاتا۔ سالہا سال سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔

کل رات بارش ہو رہی تھی۔ سردیوں کی بارش' میں نیلا گنبد سے رکشے میں سوار ٹی ہاؤس کے سامنے سے گزرا۔ ٹریفک کی روشنی سرخ تھی۔ رکشا ٹی ہاؤس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ٹی ہاؤس کے پردہ پوش شیشوں کے پیچھے دھندلی روشنی میں اپنے پیارے دوستوں کے چہرے ابھرتے دیکھے۔ کچھ چہرے بوڑھے ہو گئے تھے' کچھ صورتیں مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی تھیں' کچھ اداس تھیں' گہری سوچ میں گم تھیں۔

فلک نے پھینک دیا برگ گل کی چھاؤں سے دور
وہاں پڑے ہیں جہاں خار زار بھی تو نہیں

(ناصر کاظمی)

◆◆◆

باغ جناح کے گلاب

جناح باغ کا پہلا نام لارنس گارڈن ہوا کرتا تھا۔

نام کے ساتھ ساتھ اس باغ کی خصوصیات بھی تبدیل ہوگئی ہیں۔ مثلاً پہلے چڑیا گھر اتنا وسیع نہیں تھا۔ چڑیا گھر کے دروازے کے پہلو سے ہو کر جو سایہ دار راستہ لارنس باغ کے اندر جاتا تھا وہ اب چڑیا گھر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اوپن ائیر کیفے کے سامنے بھی کچھ درختوں کو کاٹ دیا گیا ہے۔ جہاں ایک کیبن ہوا کرتا تھا جس کے اندر صرف ایک میز اور تین کرسیاں بچھی رہتیں۔ لڑکیاں لڑکے یہاں بیٹھ کر چائے پر باتیں کرتے۔ اس کیفے کے برابر میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی عقبی باغ کی طرف نکل جاتی ہے۔ ان دنوں یہاں لیچی کے تین چار درخت ہوا کرتے تھے۔ پھل دینے کا موسم آتا تو یہاں ایک رکھوالا اپنی چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہنے لگتا۔

''سویرا'' کے ایڈیٹر نذیر چوہدری نے ایک روز یہاں ترقی پسند مصنفین کے اعزاز میں دعوت کر ڈالی۔ یہ آج سے بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس دعوت میں مشہور فوٹو گرافر حفیظ نے کچھ یادگار تصویریں بنائیں۔

کھانا اوپن ائیر کیفے کے لان میں لگایا گیا اور باقی وقت باغ کی سیر و سیاحت اور خوش گپیوں میں گزرا۔ یہ بہار کا موسم تھا۔ باغ کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ نذیر چوہدری کی اس دعوت نے دوسرے پبلشروں کو چوکنا کر دیا۔ نتیجہ ادیبوں کے حق میں نکلا۔

''نقوش'' کے محمد طفیل نے بھی لارنس باغ میں ادیبوں کی چائے پر مدعو کر لیا۔ اس دعوت میں شوکت تھانوی' اشفاق احمد اور سعادت حسن منٹو نے بھی شرکت کی۔ ہم سب کا گروپ فوٹو نقوش میں چھپا اور دعوت کا حال بھی۔۔۔۔۔۔۔اب بھلا چوہدری برکت علی کب پیچھے رہنے والے تھے۔ انہوں نے لارنس باغ ہی میں دعوت کا اعلان کر دیا۔ اس دعوت میں چراغ حسن حسرت میر مجلس تھے۔ بڑی لطیفہ گوئی ہوئی۔ حسرت صاحب اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں محفل کو زعفران زار بناتے رہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس کا اہتمام بھی لارنس باغ کے اوپن ائیر تھیٹر میں ہی کیا گیا۔ پنڈال کو مختلف سلوگنوں اور اردو پنجابی' پشتو' سندھی اور بلوچی کے عوامی شاعروں کی تصاویر سے سجایا گیا۔ میرے اور حمید احمد (آف موہنی حمید فیم) کے ذمے سٹیج اور پنڈال کو زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بنانے کا کام تھا جو ہم دونوں نے بطریق احسن پورا کیا۔ اس کانفرنس کی تفصیلات اب مجھے یاد

نہیں رہیں۔ اتنا یاد ہے کہ شہر سے لارنس باغ آتے جاتے میں مجھ سے کرائے کی ایک سائیکل گم ہوگئی تھی۔ اس باغ سے میری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ ان خوبصورت یادوں میں ایک یاد کا تعلق احمد ندیم قاسمی سے ہے۔

ان ہی دنوں کی بات ہے۔۔۔۔۔۔۔میرا خیال ہے گرمیوں کی شام تھی' ابھی سورج کی نارنجی روشنی آسمان پر باقی تھی۔ غالباً ہم میکلوڈ روڈ والے ''سویرا'' کے دفتر سے باہر نکل رہے تھے کہ میں نے قاسمی صاحب سے کہا کہ لارنس باغ چلنا چاہیے۔ انہوں نے میرا دل نہ توڑا اور ساتھ چل پڑے۔ ہم دونوں لارنس کے اوپن ائیر کیفے کے گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ گئے۔ چائے پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے قاسمی سے ''میرا گاؤں'' نظم سنانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے بڑی محبت سے نظم سنائی۔ یہ نظم ان کے مجموعہ ''جلال و جمال'' میں چھپی ہے اور مجھے بے حد پسند تھی۔ یہ ایک مختصری نظم ہے لیکن ضلع سرگودھا کے سارے گاؤں' سارے کھیت' ساری نہریں' سارے کچے مکان' مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں' محنت کش کسان' فاقہ کش کسان اس چھوٹی سی نظم میں سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے ان علاقوں میں بڑی آوارہ گردی کی ہے۔ یہاں مکانوں کے عقب میں سرخ سورج کو غروب ہوتے اور پھر اسے سرسوں کے کھیتوں میں طلوع ہوتے بھی دیکھا ہے۔ غریب عورتوں کو گھڑے سروں پر رکھے سات سات میل سے پانی لاتے اور حویلیوں میں جاگیرداروں کو لکس صابن سے اپنے شکاری کتوں کو نہلواتے بھی دیکھا ہے۔

لارنس باغ اب باغ جناح ہو کر پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگیا ہے۔ گلستان فاطمہ میں ولایتی گلاب دیکھ کر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ خود بھی گلاب بن کر چپکے سے کسی خاردار ٹہنی سے جا لگوں۔ ان دنوں فلیمنگ روڈ پر آ گیا تھا۔ ہر روز صبح کو لارنس باغ سیر کے لیے جاتا۔ جس روز گلاب کے پھول توڑنے ہوتے منہ اندھیرے ہی بڑا لفافہ اور چھوٹی قینچی جیب میں ڈال کر نکل پڑتا۔ باغ میں ادھر ادھر سیر کرنے کی بجائے گلستان فاطمہ میں آ تا۔ قینچی اور لفافہ گلاب کے پودے کے پاس رکھ دیتا اور جھوٹ موٹ ورزش شروع کر دیتا ایک بار دونوں ہاتھ اوپر لے جاتا اور پھر ہاتھوں کو پیروں کے پنجوں کے ساتھ لگانے کی کوشش کرتا اس کوشش میں جھٹ سے قینچی پکڑتا اور دو تین گلاب کے پھولوں کو توڑ کر وہیں زمین پر رکھ دیتا۔ دور سے دیکھنے والے چوکیدار وغیرہ کو یہ تاثر دیتا کہ میں ورزش کر رہا ہوں حالانکہ حقیقت میں' میں پھولوں کی جڑیں کاٹ رہا تھا۔ یہ پھول توڑ کر ورزش میں گلاب کے ہر تختے کے پاس جا کر کرتا۔ ہر تختے پر دو چار پھولوں کی لاشیں پڑی ہوتیں۔ آخر میں اسی طرح ورزش کرتے ہوئے پھولوں کو لفافہ میں ڈالتا اور تیز دوڑنے کی ورزش پر عمل کرتے ہوئے بہت جلد لارنس باغ سے باہر نکل آتا۔ ایک روز باغ کے دروازے پر مالی نے مجھے پھولوں سمیت پکڑ لیا۔ میں نے جھٹ کہا۔ ''گھر میں ختم شریف ہے' گلاب دانوں میں لگانے کے لیے پھول لے جا رہا ہوں۔''

مالی نے مجھے کچھ نہ کہا۔ گھر میں ختم شریف تو نہ تھا لیکن میں نے گلستان فاطمہ کے اکثر گلاب ختم کر دیئے۔ اس کے لیے باغ جناح کے رکھوالوں سے معذرت چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے پھول توڑ ورزش ختم کر دی ہے بلکہ ان لوگوں پر حیران ہوتا ہوں جو پھولوں کے کٹے ہوئے سر اپنے گریبانوں میں سجاتے ہیں۔

◆◆◆

فٹ پاتھ کی راتیں

گھر سے باہر میں نے ان گنت راتیں بسر کیں۔ یہ راتیں اگر بستر سنجاب وسمور پر گزاری ہیں تو فٹ پاتھ اور ریلوے کے ٹھٹھرے پلیٹ فارموں پر بھی کاٹی ہیں۔ بے خوابی کی ان بے سروسامان راتوں نے مجھ سے میرا آرام' میری نیند ضرور چھینی لیکن اس کے عوض مجھے بہت کچھ دیا بھی۔ ان سنگدل بے آرام راتوں نے مجھے بڑا سخت جان بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں جس جگہ' جہاں' جس وقت چاہوں سو سکتا ہوں اور کم سے کم نیند سے زیادہ سے زیادہ توانائی حاصل کر سکتا ہوں۔ میری نیند تکیے اور بستر کی محتاج نہیں رہی۔ یہ بے خواب راتیں ساری کی ساری مجھے یاد ہیں۔ ان میں ایسی راتیں بھی ہیں جو دن بھر فاقے کے بعد آئیں اور مجھے کسی فٹ پاتھ پر بٹھا کر دور کھڑی اپنی تاریک آنکھوں سے میری بے بسی کا تماشا کرتی رہیں۔ پھر بھی یہ ساری راتیں مجھے عزیز ہیں اور ان کی یادیں مجھے عزیز ہیں۔ دوسرے فائدوں کے علاوہ ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب بھی ان کا خیال آتا ہے مجھے نیند آ جاتی ہے۔ کیونکہ یہ ساری کی ساری راتیں ایسی ہیں جنہیں میں نے آنکھوں میں کاٹ دیا۔

اس سلسلے میں مجھے ایک سادھو ہمیشہ یاد رہے گا۔ تشکیل پاکستان سے پہلے کی بات ہے میں ریل کار کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بیٹھا مدراس سے کولمبو جا رہا تھا' گاڑی غالباً ترچنالی جنکشن سے نکلی تو رات گہری ہو گئی۔ کچھ مسافر برتھ پر بستر لگا کر سو گئے' کچھ ایک دوسرے کے کندھوں پر سر رکھے اونگھنے لگے۔ کچھ مسافروں کو نیند نے بیٹھے بیٹھے دبوچ لیا۔ وہ جھونک میں آ کر ایک دم آگے کو گرتے جھٹ سے چونک کر شرمسار سے ہو کر ادھر ادھر دیکھتے اور پیچھے ہٹ کر پھر اونگھنے لگتے۔ اس ڈبے میں ایک گیروے کپڑوں والا سر منڈا مدراسی سادھو کونے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ مجھے بھی نیند آ گئی۔ میں بھی اونگھنے لگا۔ اونگھتے اونگھتے میرا سر کسی کے کندھے' گھٹنے یا سر سے ٹکراتا تو میں چونکتا۔ اور میں ہر بار ایک ہی منظر دیکھتا کہ وہ سادھو اسی طرح کونے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور چہرے پر ہلکا سا تبسم ہے۔ میں بڑا حیران ہوتا کہ اس سادھو کو اونگھ کیوں نہیں آتی۔ اس کا سر کسی کے کندھے' گھٹنے یا سر سے کیوں نہیں ٹکراتا۔ نیند نے ڈبے کے ہر مسافر پر حملہ کر دیا تھا' ہر مسافر نیند کے جال میں الجھا ہوا تھا لیکن وہ سر منڈا سادھو نیند کی زد سے بالکل محفوظ تھا بلکہ نیند کا مذاق اڑا رہا تھا۔

صبح ہوئی تو ہر مسافر کا چہرہ باسی' تھکا تھکا اور پژمردہ تھا لیکن اس سادھو کا چہرہ تازہ کھلے ہوئے کنول پھول کی طرح تر و تازہ اور

شاداب تھا۔ میری عمر اتنی نہیں تھی کہ میں اس سادھو سے اس شب کی بیداری سے تروتازگی اور توانائی حاصل کرنے کے راز کے بارے میں بات کرتا' بہر حال میرے دل میں یہ بات نقش ہو گئی کہ کوئی ایسا خیال بھی ہے جو انسان کو نہ صرف یہ کہ نیند سے نجات دلاتا ہے بلکہ شب بیداری میں اسے طاقت اور شگفتگی بھی عطا کرتا ہے۔

اس کے بعد میری بے خواب ویران راتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے ہر بار کسی بنچ' کسی پتھر' کسی کھمبے کے ساتھ لگ کر اونگھتے ہوئے اس سادھو کو یاد کیا۔ اس کی مثال سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کی' مگر ہر بار ناکام رہا۔ ایک بار تو میں کلکتہ شہر کے ایک فٹ پاتھ پر باقاعدہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر مصنوعی تبسم پھیلا لیا لیکن نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ میں اپنی آلتی پالتی سمیت ایک طرف کو لڑھک گیا۔ کلکتے میں یہ تیسری بے خواب رات تھی۔ پہلی دو راتیں میں نے خضر پور جیٹی کی طرف دریائے ہگلی کے کنارے ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی میں گزاری تھیں۔ وہاں دوسری رات کے پچھلے پہر کتوں نے ہلہ بول دیا تو میں وہاں سے اٹھ کر چورنگی کی طرف آ گیا۔ کلکتے اور بمبئی میں فٹ پاتھوں پر سونا کوئی عیب کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جو لوگ ان شہروں میں رہ چکے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ رات کو مزدور اور بے گھرے بڑے آرام سے ان فٹ پاتھوں پر لیٹ کر سو جاتے ہیں۔ مجھے فٹ پاتھ پر سوتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ وکٹوریہ میموریل کے باغ میں سونے کی کوشش کی۔ مگر وہاں مکھی کے برابر مچھروں نے مجھے ایک منٹ کے اندر اندر تباہ کر دیا۔ زکریا سٹریٹ کے علاقے میں ہمارے رشتہ دار کشمیری شال باف رہتے تھے۔ لیکن چونکہ میں گھر سے بھاگا ہوا تھا اس لیے ادھر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جوں ہی ادھر گیا رشتہ دار پکڑ کر واپس امرتسر بھجوا دیں گے اور وہاں میرا پہلوان باپ میری ٹھکائی کرے گا۔ اس کے خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

میں چلتے چلتے ڈلہوزی سکوائر کی جانب میٹرو سینما کے پاس آ گیا۔ یہاں ایک ستون کے پاس فٹ پاتھ خالی تھا۔ میں ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر اتنے بڑے شہر میں کب تک فٹ پاتھوں اور پارکوں میں سوتا رہوں گا۔ لیکن یہ خیال بڑی تیزی سے میرے ذہن سے نکل گیا۔ اس لیے کہ بڑے بڑے شہروں کی آوارہ گردی میں مجھے بے حد مزہ آتا تھا۔ دریا' ناریل کے درخت سمندروں کی طرف سے چلنے والی مرطوب ہوائیں اور بانس کے گھنے جنگلوں کی بارشیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ مجھے اپنی محبت میں اڑائے لیے پھرتا تھا۔ میٹرو سینما کے ستون سے لگے لگے میں سو گیا۔ ایک نحیف و نزار بنگالی عورت اپنے کمزور و ناتواں بچے کو ساتھ لپٹائے ذرا پرے فٹ پاتھ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بچے کے رونے سے میری آنکھ کھل گئی۔ جانے رات کا کیا بجا تھا۔ ڈلہوزی سکوائر کے باغ میں بتیاں روشن تھیں کبھی کبھی کوئی موٹر گاڑی تیزی سے گزر جاتی۔ میں نے جیب سے پاسنگ شو کا سگریٹ نکال

کر سلگایا۔ میرا دل آوارہ گردی کرنے کو بے قرار ہو گیا۔ میں فٹ پاتھ سے اٹھا اور دریائے ہگلی کی طرف چل پڑا۔ کلکتے کے کالے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ میں بہت دیر تک فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ اب ایک بہت وسیع باغ کا آہنی جنگلہ شروع ہو گیا۔ باغ کی جانب سے مور کے بولنے کی آواز آئی اب جو ہوا کا جھونکا آیا تو اس میں دریائے ہگلی کے پانی کی ٹھنڈک اور اس کے کنارے اگے ہوئے ناریلوں کی خوشبو تھی۔ میرا ذہن اور جسم ایک دم تروتازہ ہو گیا۔ دریا پر پہنچا تو اس کا مٹیالا پانی تاروں کا عکس لیے خلیج بنگال کی طرف خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ دریا کی لہریں پر سکون تھیں پھر بھی میں نے غور سے سنا تو دریا کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہلکی ریشمی سرسراہٹ ایسی آواز۔۔۔۔۔۔۔ جیسے رات کے اندھیرے میں کوئی دلہن قریب سے گزر جائے۔ ایک شکستہ بنچ خالی تھا۔ میں بنچ پر بیٹھ گیا اور دریا کو' دریا کے کنارے ناریل کے درختوں اور صبح کی ہوا میں جھومتے کیلوں کے پتوں کو دیکھنے لگا۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں دریا' ناریل اور کیلے کے درختوں سے بے نیاز ہو کر وہیں بنچ پر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو گہرے نیلے آسمان پر بگلوں کی قطار اڑی جا رہی تھی۔ دریا کا پاٹ تیز دھوپ میں شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور مجھے بے حد بھوک لگ رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیا کھایا جائے! سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کہاں سے کیسے کھایا جائے۔

◆◆◆

بوڑھا امریکی اور نکاح نامہ

دن کا بیشتر حصہ میں دریائے ہگلی کے کنارے آوارہ گردی کرتا رہتا۔ میرے داہنے ہاتھ پر خضر پور گارڈن دور تک چلا گیا تھا۔ اس باغ میں ناریل' آم اور پپیتے کے جھنڈوں کے جھنڈ تھے۔ اب دھوپ تیز ہوگئی تھی۔ درختوں کی چھاؤں میں کالی پتلی ٹانگوں والے بنگالی مزدور اور بھکاری بے سدھ ہوکر سو رہے تھے۔ اب مجھے بھوک نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میری جیب میں ایک پائی بھی نہ تھی۔ دریا کے کنارے ایک جگہ گھاٹ بنی تھی اور پمپ لگا تھا۔ میں نے پمپ چلا کر پانی پیا جو کھاری تھا۔ ایک بنگالی بوڑھا چھابڑی میں آم رکھے اونگھ رہا تھا ادھر ادھر کوئی بھی نہیں تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آم چرانے کا خیال آیا۔ میں پیچھے کی طرف بوڑھے پھل فروش کی طرف بڑھا اور آہستہ سے جھک کر چار پانچ آم چرا لیے۔ آم چرا کر وہاں سے اٹھ بھاگا اور کافی دور ایک جگہ دریا کے کنارے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور آم چوسنے لگا۔ ان آموں نے میری بھوک کافی حد تک مٹا دی۔ میں کچھ تازہ دم ہوگیا۔ اب میں نے شہر کا رخ کیا۔ پیدل چلتے چلتے میں ڈلہوزی اسکوائر واپس آ گیا۔ میٹرو سینما کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ یہ سینما ائیر کنڈیشنڈ تھا۔ کھلے دروازے میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ وہاں کچھ اور مزدور لوگ بھی بیٹھے تھے اور کلکتہ کی گرمی میں ٹھنڈی ہوا کے لطف لے رہے تھے۔ میں بھی بیڑی سلگا کر وہاں بیٹھ گیا۔ کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ شاید سینما والوں کو پتہ چل گیا کہ کچھ غریب لوگ سینما کے باہر بیٹھے ان کی ٹھنڈی ہوا کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں' چنانچہ انہوں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔

کلکتے کی کشادہ اور بارونق سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے شام ہوگئی۔ اب مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ مجھے دال بھات کھائے بیس بائیس گھنٹے ہوگئے تھے۔ شہر میں سوائے رشتہ داروں کے اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جہاں سے مجھے کھانا مل سکتا۔ وہاں یہ خطرہ تھا کہ وہ مجھے گرفتار کر کے واپس امرتسر بھجوا دیں گے لیکن بھوک نے مجھے بے حال کر دیا اور میرے قدم اپنے آپ زکریا سٹریٹ کی طرف اٹھنے لگے۔ دل میں بار بار خیال آتا کہ واپس ہو جاؤں مگر بھوک نے سارے خیالوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ میں زکریا سٹریٹ میں داخل ہوا ہی تھا' ایک دوکان کے باہر خواجہ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ خواجہ صاحب پکی عمر کے گورے چٹے عیش پسند آدمی تھے۔ ہمارے دور کے رشتہ دار تھے' مگر صاف دل' صاف گو تھے۔ امریکیوں اور دوسرے غیر ملکی لوگوں کے ہاں پھیری لگا کر پشمینے کی شالیں قدیم نوادرات اور قالین بیچتے تھے۔ جو کماتے جوئے اور شراب کی نذر کر دیتے' یہاں تک کہ دوکان

داروں سے کمیشن پر قالین لے کر فروخت کر کے شراب پی جاتے۔ دوکانداروں نے اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ ہاتھ تنگ ہوا تو ایک روز اپنی مرحومہ بیوی کا پرانا نکاح نامہ صندوق میں سے نکالا اور ایک بوڑھے امریکی کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ پہلے زمانوں کے نکاح نامے بڑے لمبے چوڑے ہوتے تھے' چاروں طرف رنگ دار بیل بوٹے وغیرہ بنے تھے اور کالی سیاہی سے عربی نما اردو لکھی ہوئی تھی۔

خواجہ صاحب نے نوادرات پسند بوڑھے امریکی کے آگے بوسیدہ نکاح نامہ پھیلا دیا اور کہا' یہ وہ عہد نامہ ہے جو انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان ہلدی گھاٹ پر ہوا تھا۔ سیدھا سادہ بوڑھا امریکی تو خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا اور اس کپے نے اس زمانے کے تین ہزار روپوں میں وہ نکاح نامہ یا عہد نامہ خرید لیا۔ خواجہ صاحب نے فوراً درجن بھر بوسکی کی قمیضیں اور جاپانی کے لٹھے کی شلواریں بنوائیں۔ باداموں کی بوری بیٹھک میں ڈلوائی' سونے کی چار انگوٹھیاں بنوا کر انگلیوں میں پہن لیں اور رات کو شراب پی کر' کریون اے کا ڈبہ ہاتھ میں لیے جوئے خانوں کا چکر کاٹنے لگے۔ بہت جلد وہ دن بھی آ گیا کہ خواجہ صاحب کی ساری سونے کی انگوٹھیاں جوئے اور شراب کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اور وہ گھر کے کونے کھدرے میں کوئی ''نادر'' شے تلاش کرنے لگے۔ بہر حال اس روز مجھے دکان کے باہر زکریا سٹریٹ میں ملے تو ان کے ہاتھوں میں سونے کی تین انگوٹھیاں چم رہی تھیں یعنی خواجہ صاحب کو کہیں سے مال ہاتھ لگ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حیرانی سے بولے۔

''اوئے توں کتھے میدیا؟''

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ خواجہ صاحب کی جگہ کوئی دوسرا رشتہ دار نہیں ملا۔ کیونکہ وہ جب بھی مجھے ملتے یہی نصیحت کیا کرتے۔

''میری مانو' پڑھائی وڑھائی چھوڑ دو' میرے شاگرد بن جاؤ۔ جوا کھیلنے کی مجھ سے ٹریننگ لے لو۔ یہ فن میرے ساتھ ہی قبر میں چلا جائے گا۔ تمہیں ایسا تاک کردوں گا کہ سال دو سال میں ہزاروں میں کھیلنے لگے گا۔ خدا کی قسم تجھے آوارہ گردی کرتے دیکھتا ہوں تو دل خوش ہوتا ہے۔''

اور یہ بات ٹھیک تھی کہ خواجہ صاحب کو میرا بار بار گھر سے بھاگنا بہت پسند تھا۔ انہوں نے دو ایک بار مجھے جوئے کی باقاعدہ تعلیم بھی دی تھی لیکن میرا اس میں جی نہ لگا حالانکہ میں جوئے کو برا نہیں سمجھتا تھا' بس مجھے تاش اور چھکے والا دانہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے شراب پی کر چورنگی کی سیر کی دعوت دی مگر میں نے شراب نہ پی۔

خواجہ صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا تو وہ تڑپ اٹھے۔

''اوئے کشمیریوں کی اولاد' اور بھوکی رہے۔''

وہ مجھے امجد ہوٹل میں لے گئے اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اب رات بسر کرنے کا مسئلہ پھر میرے سر پر کھڑا تھا۔ خواجہ صاحب

بولے۔

’’یار! میں خود رشتہ داروں کے فلیٹ میں رہتا ہوں‘ تمہیں بھی وہیں چل کر سونا ہوگا۔ کیا کروں آج کل ہاتھ تنگ ہے۔ یہ دو تین سونے کی انگوٹھیاں رہ گئی ہیں۔۔۔۔۔۔کل انہیں بیچ کر آخری داؤ لگاؤں گا‘ یا شہنشاہ بن جاؤں گا یا خاک سیاہ۔‘‘

میں نے کہا۔

’’اگر میں آپ کے ساتھ گیا تو وہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے اور کل پنجاب میل میں اپنے محافظ کے ساتھ واپس امرتسر پارسل کر دیں گے۔‘‘

’’یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو‘ یہ کمینے لوگ ہیں۔ مجھے تمہاری آوارہ گردی بڑی پسند ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر خدا نے چاہا تو ایسی آوارہ گردی میں تم ایک نہ ایک دن جواری اور شرابی اور کبابی بن جاؤ گے بس یہی میری حسرت ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار تمہیں شراب پیتے اور جوا کھیلتے دیکھ لوں۔‘‘

صاف ظاہر تھا کہ اگر میں خواجہ صاحب کے ساتھ اپنے رشتہ داروں کے فلیٹ پر چلا جاتا تو فوراً قابو کر لیا جاتا مجبوراً مجھے خواجہ صاحب سے جدا ہونا پڑا انہوں نے جیب سے چاندی کے دو روپے نکال کر مجھے دیئے۔

’’بس یہی میرے پاس ہے‘ اسے اپنے پاس رکھو۔‘‘

کلکتے کی جی بھر کے آوارہ گردی ان دو روپوں کی شراب پیو‘ جوا کھیلو‘ مجرا سنو‘ یہ تمہاری مرضی ہے۔۔۔۔۔۔میں تو واپس ان کمینے رشتہ داروں کے پاس جا رہا ہوں کیونکہ آج انہوں نے ساگ مچھلی پکائی ہے۔

خواجہ صاحب جھومتے جھامتے مسجد ناخدا کی طرف چل دیئے اور میں دو روپے جیب میں ڈال کر چت پور روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سراج بلڈنگ کے باہر ہی پان والے کی دوکان پر میں نے پاسنگ شو کی ایک ڈبی خریدی۔ پان کھایا‘ سگریٹ سلگا کر وہاں کھڑا بازار سے گزرتی سبز رنگ والی موٹر ٹراموں کو دیکھتا رہا۔ سراج بلڈنگ میں میرا ایک دوست جان رہا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے چچا کے ساتھ بمبئی گیا ہوا تھا اس کی چالی میں ایک سکھ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ یہ معلومات میں نے پہلے ہی روز حاصل کر لی تھیں۔ لوئر چت پور روڈ کا یہ چوک بڑا مصروف چوک تھا۔ یعنی انارکلی کے نیلے گنبد والے چوک کو چھ سے ضرب دے لیں۔ بنگالی پان والے کی دوکان سے طرح طرح کے قواموں اور تمباکوؤں کی خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے یہ خوشبو بڑی اچھی لگی۔ میں دیر تک اس دوکان کے باہر کھڑا رہا۔ اب بھی میں انارکلی کی پانوں والی گلی میں سے ضرور گزرتا ہوں اس لیے کہ یہاں مجھے وہی خوشبو آتی ہے اور مجھے اپنا گزرا ہوا خوبصورت‘ بھوکا‘ بے یار و مددگار زمانہ یاد آ جاتا ہے‘ جب مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ دن میں ایک بار بھی کھانا کہاں سے جاؤں گا اور رات کس باغ‘ کس فٹ

پاتھ پر بسر کروں گا۔ مجھے اس کاسموپولیٹن شہر کے ٹھنڈے ننگے فٹ پاتھوں اور باغ کے بنچوں سے کوئی شکایت نہیں۔ اگر شکایت ہے تو وہاں کے خوفناک مچھروں سے جنہوں نے راتوں کو ہر جگہ میرا تعاقب کیا۔ مجھے جی بھر کر کاٹا اور سونے نہ دیا۔ نیند سے مجھے کئی گلا نہیں‘ اس دردمند خاتون نے فٹ پاتھ کے ننگے پتھروں پر بھی مجھے اپنے سینے سے لگایا لیکن مچھروں نے اس نیک دل خاتون کو بھی مجھ سے دور بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اگر حسن اتفاق سے مجھے کسی فلیٹ‘ کسی کھولی یا کسی چالی میں کھاٹ پر سونے کا سنہری موقع مل جاتا تو وہاں کھٹمل حملہ کر دیتے۔ کھٹمل سے مجھے انتہائی نفرت ہے۔ وہ جس طرح حملہ کرتا ہے میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ چنانچہ انہیں مارنے کی بجائے میں صاحب خانہ کو اطلاع دیئے بغیر چپکے سے اس فلیٹ‘ کھولی یا چالی سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاتا۔ کھلی فضا میں بازو پھیلا کر اطمینان کا سانس لیتا اور باقی رات بڑی خوشی اور مسرت کے ساتھ اس شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے گزار دیتا۔

◆◆◆

کیمیا گر سنیاسی

میرے خالو جان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے' انہیں خاندان والے بڑے شاہ جی کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ میری عمر دس گیارہ برس کی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی صورت اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پکا رنگ' چہرے پر چیچک کے داغ' سفید پگڑی' سفید کرتہ' سفید کھدر کی شلوار' پاؤں میں لال دیسی جوتی' وہ شکل و صورت سے ہرگز کشمیری نہیں لگتے تھے۔ چہرے پر ہمیشہ ایک درویشانہ مسکراہٹ رہتی' کندھے پر گردن کو ذرا جھکا کر بات کرتے' آواز تیز تھی' قریب کھڑے آدمی کو یوں آواز دے کر بلاتے جیسے وہ بہت دور کھڑا ہو۔ طبیب تھے لیکن طباعت کا سارا سامان گھر میں ہی رکھا تھا۔ مریضوں کا علاج گھر پر کرتے یا مریض کے گھر جا کر دوائی دے آتے۔ میرے خالو جان کھانے پینے کے عاشق تھے۔ بڑے شاہ جی کو کھانے پینے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ گھر میں جو پکا ہوتا بے نیازی سے کھا لیتے۔ انہیں اگر شوق تھا تو کیمیا گری کا۔

اب میں جو کچھ بیان کروں گا اپنے دادا جان مرحوم کی روایات کی روشنی میں بیان کروں گا۔ دادا جان کی زبانی معلوم ہوا کہ کیمیا گری کا شوق انہیں جنون کی حد تک تھا۔ بڑے شاہ جی دادا جان کے دوست تھے۔ ان کی ٹولی میں ایک خلیفہ صاحب بھی شامل تھے۔ موصوف موسم کا پھل صرف ایک بار کھاتے۔ امرود کے موسم میں دو تین سیر امرود کنالی میں کپا لو کر کے سامنے رکھ لیتے اور دیکھتے دیکھتے چٹ کر جاتے۔ پھر سارے موسم امرود کو ہاتھ نہ لگاتے۔ میرے دادا جان بڑے شاہ جی اور خلیفہ صاحب' یہ تینوں دوست اکثر امرتسر کی بڑی نہر یعنی بجلی والی نہر پر پکنک منانے جایا کرتے۔ اس زمانے کی پکنک یہ ہوتی کہ گھر سے قورمہ' کلچے اور آم ساتھ لے جاتے۔ نہر کنارے آم کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں دری بچھا کر بیٹھ جاتے۔ آم کا جھولا رسی سے باندھ کر نہر کے ٹھنڈے پانی میں لٹکا دیتے' گپ لڑاتے' نہاتے' کلچے اور قورمہ اڑاتے' نہاتے' پھر کھاتے' پھر نہاتے' آم چوستے اور شام کو گھر واپس آ جاتے۔

دادا جان روایت کرتے ہیں کہ گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں وہ لوگ نہر پر پکنک منا رہے تھے کہ اچانک ایک لنگوٹی پوش سنیاسی کا ادھر سے گزر ہوا۔ یہ لوگ دری پر بیٹھے آم چوس رہے تھے کہ اچانک بھبوت رمائے وہ سنیاسی ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''بابا لوگ! بھوک لگی ہے۔''

بڑے شاہ جی جو کیمیا گری کے شوق میں ہمیشہ سنیاسی لوگوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے' فوراً مودب ہو کر بولے۔

''تشریف لایئے جوگی بابا! روکھی سوکھی حاضر ہے۔''

بڑے شاہ جی نے سنیاسی بابا کے آگے بھونا ہوا گوشت اور نان رکھے۔ سنیاسی نے گوشت کو تو ہاتھ نہ لگایا البتہ آم کے ساتھ آدھا نان کھایا' ٹھنڈا پانی پیا اور بولا۔

''آپ نے سنیاسی کو بھجن کھلایا ہے۔ سنیاسیوں کا اصول ہے کہ جو کوئی ان کی سیوا کرتا ہے وہ سیوا کا پھل ضرور دیتے ہیں۔ بولو' بابا لوگ! تم کو کس شے کی ضرورت ہے؟''

بڑے شاہ جی تو موقع کی تاک میں تھے' فوراً بولے۔

''سنیاسی بابا! مجھے سونا بنانے کا گر بتا دیں۔''

دادا جان کہتے ہیں کہ بڑے شاہ جی کی اس خواہش پر سنیاسی کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے کہہ رہے ہوں۔ ارے شاہ جی! مانگا بھی تو کیا مانگا۔ وہ بولا' مجھے وہاں لے چلئے جہاں آپ رہتے ہیں۔

بڑے شاہ جی سنیاسی کو اپنے محلے بازار وانان میں لے آئے اور ایک بیٹھک میں ٹھہرا دیا۔ سنیاسی نے ایک من تھاپیاں منگوائیں۔ تانبے کا ایڈورڈ ہفتم والا گول پیسا منگوا کر اس کے گرد گوندھا ہوا آٹا لپیٹا' اسے مٹی کے کوزے میں رکھ کر کوزے کا منہ گیلی مٹی سے بند کیا۔ تھاپیوں کی آگ جلائی اور بیچ میں وہ مٹی کا کوزہ رکھ دیا۔ ایک رات اور آدھا دن آگ جلتی رہی۔ جب آگ کی تمازت ماند پڑ گئی تو سنیاسی نے لکڑی سے کرید کر مٹی کا کوزہ باہر نکالا' اسے توڑ کر تانبے کا پیسہ چمٹے سے پکڑ کر لکڑی کی چوکی پر رکھا۔ جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر اس میں سفید عرق کا ایک قطرہ پیسے پر ڈالا۔ اسے دوبارہ تھاپیوں کی آگ میں ایک پل کے لیے رکھا' پھر باہر نکال کر جھاڑا تو وہ خالص سونے کے پاؤنڈ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بڑے شاہ جی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سنیاسی نے شیشی بڑے شاہ کی طرف بڑھا کر کہا۔

''شاہ جی! یہ شیشی لیجئے آپ کی پشتوں کے لیے کافی ہو گی۔''

لیکن شاہ جی نے کہا۔

''بابا جی! یہ بتائیں کہ اس شیشی میں جو عرق ہے اسے بنانے کا نسخہ کیا ہے؟''

دادا جان روایت کرتے ہیں کہ سنیاسی ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے بڑے شاہ جی کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ

رہا ہو‘ تم بدقسمت ہو شاہ جی۔۔۔۔۔۔۔ پھر شیشی اپنے بغچے میں ڈال کر بولا۔

’’اچھا‘ اگر آپ کو عرق کا نسخہ چاہیے تو کوئی بات نہیں اب رات ہو گئی ہے صبح آپ کو بتادوں گا۔ ذرا لمبا نسخہ ہے۔‘‘

بڑے شاہ جی بڑے خوش ہوئے۔ آدھی رات سنیاسی بابا کی خدمت کرتے رہے۔ کبھی چائے بنا کر دے رہے ہیں‘ کبھی پاؤں دبا رہے ہیں۔ آدھی رات کو سنیاسی بابا کو بیٹھک میں سلا کر خوشی خوشی گھر آ گئے کہ صبح سونا بنانے کا اصل گر ہاتھ آ جائے گا اور گھر کے سارے تانبے کے برتنوں کو سونے میں تبدیل کر دیں گے۔

دن چڑھا تو سنیاسی بابا کے لیے بڑے چاؤ سے دہی اور کلچے لے کر بازار والی بیٹھک میں گئے تو دیکھا بیٹھک کا دروازہ کھلا ہے اور سنیاسی کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا‘ سونے کی چڑیا اڑ گئی تھی۔ دادا جان کہتے ہیں کہ بڑے شاہ جی کو زندگی بھر یہ افسوس رہا کہ انہوں نے زیادہ لالچ کیوں کیا۔

بڑے شاہ چونکہ طبیب تھے اس لیے طرح طرح کی دوائیاں گھر پر ہی بنایا کرتے تھے۔ ایک دوائی کے سلسلے میں انہیں آک کے دودھ کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے حسن دین مالی سے کہا کہ وہ آک کا دودھ گھر دے جائے۔ حسن دین مالی ایک روز آک کے دودھ کا بھرا ہوا گلاس گھر میں دے گیا۔ اتفاق سے چھوٹے شاہ جی یعنی میرے عبدالرحمٰن جن والے خوش خوراک خالو جان کے گھر میں آئے تو انہوں نے بڑے شاہ جی کے کمرے میں میز پر جھاگ دار دودھ سے بھرا ہوا گلاس دیکھا‘ سمجھے کہ گوجر بھینس کا تازہ دودھ دے گیا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ‘ گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی ڈیک میں غٹا غٹ پی گئے۔ تازہ دودھ کے عشق میں آک کی تلخی بھی محسوس نہ ہوئی۔ گلاس ختم کیا تو حلق کڑوا ہو گیا۔ محسوس ہوا کہ کوئی غلط شے پی گئے ہیں۔ آک کے دودھ نے فوراً اپنا اثر دکھایا اور طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ چھ روز بستر پر پڑے رہے۔ ساتویں روز بڑے شاہ جی نے چھوٹے شاہ جی یعنی اپنے چھوٹے بھائی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا‘ یاسین صاحب! آک کا دودھ پی کر کوئی نہیں بچ سکتا۔ تم بچ گئے‘ جاؤ ساری زندگی تمہیں پیٹ کی تکلیف کبھی نہیں ہو گی۔

میں اس حقیقت کا عینی شاہد ہوں کہ چھوٹے شاہ جی کو میں نے اپنی ہوش میں کبھی پیٹ کی تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھا۔ لیکن ان کے پیٹ کی وجہ سے میں نے اکثر لوگوں کو پریشان دیکھا جن میں چھوٹے شاہ جی یعنی میرے خالو جان کی بیگم صاحبہ‘ میری خالہ سرفہرست تھیں۔ انہوں نے جب بھی ڈٹ کر گوشت کھانے کے بعد خالی تھالی آگے بڑھائی تو خالہ جان نے ہمیشہ خالی کف گیر ان کی پلیٹ پر مارتے ہوئے کہا۔

’’اب بس بھی کرو۔‘‘

بڑے شاہ جی جانے کس وقت انتقال کر گئے اور جانے کہاں دفن ہوئے‘ میں بہت چھوٹا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ان کے مرنے کا یقین نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مرے نہیں زندہ ہیں اور اس سنیاسی کی تلاش میں ہیں جس نے انہیں شیشی کے عرق کا نسخہ نہیں بتایا تھا۔

◆◆◆

راجدہ کی آنکھیں

ایک روز میں آرٹسٹ بھائی کے ساتھ رات گزارنے حضوری باغ چلا گیا۔ بادشاہی مسجد کے سامنے بارہ دری کے اندر اور باہر جگہ جگہ لوگ ٹولیاں بنا کر بیٹھے تھے۔ یہاں بڑا حبس تھا۔ پتھر کا ایک بنچ بھی خالی نہیں تھا۔ روشوں پر فقیروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں نے آرٹسٹ بھائی سے پوچھا۔

''تم یہاں کہاں سویا کرتے ہو؟''

''کسی جگہ پڑ رہیں گے۔''

میں نے اسے بتایا کہ میں تو ریل کے ڈبے میں بڑے مزے سے سوتا ہوں۔ چلو سٹیشن چلتے ہیں لیکن وہ بڑا ضدی ہے' نہ مانا اور مجھے بھی حضوری باغ میں ہی رات کاٹنے کا مشورہ دیا۔ ہم ایک جگہ گھاس پر سگریٹ سلگائے بیٹھ گئے۔ سامنے شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر بھی لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

ہمارے پاس بیٹھی ایک ٹولی میں کچھ لوگ چرس پی رہے تھے۔ چرس کی تیز بو نے ہمارا وہاں بیٹھنا محال کر دیا۔ ہم وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ آ گئے۔ باغ میں حبس کے علاوہ مچھروں کی بھی بہتات تھی لیکن اب ہم گرمی' غریبی' بھوک' حبس اور مچھروں کے عادی بلکہ دوست بن چکے تھے۔ ہم دونوں بھائی دیر تک امرتسر کے کمپنی باغ' ہال بازار اور ٹھنڈی کھوئی کی باتیں کرتے رہے پھر وہ گھاس پر ہی لیٹ گیا اور باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

میری ایک جانب شاہی قلعے کا سیاہ ہیبت ناک دروازہ تھا اور دوسری جانب شاہی مسجد کی عظیم سیڑھیاں اور مینار۔۔۔۔۔۔ آسمان پر ستارے دھندلے دھندلے سے تھے۔ ان دنوں ہر شے دھندلی دھندلی تھی' کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ اگلے موڑ پر کیا ہونے والا ہے۔ ہر آدمی دھند میں چلتا جا رہا تھا۔ میں درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر گھاس پر نیم دراز ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا اور راجدہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ راجدہ ہماری برادری کی ایک چپ چاپ سی لڑکی تھی' جس کے پیار میں' میں سر سے پاؤں تک شرابور تھا۔ چھ سات روز سے میں اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ آخری بار جب اس سے رخصت ہوا تو وہ کھرے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی' میں نیچے سیڑھیاں اترنے لگا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اس کی ناک میں سرخ نگ چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں

سدا کی خاموشی تھی۔ میں نے اشارے سے کہا کہ میں جا رہا ہوں وہ بھی اشارے سے کچھ کہنے والی تھی کہ اندر سے اس کی بڑی نند باہر آ گئی اور مجھے دیکھ کر بولی۔

''تم ابھی گئے نہیں حمید؟''

''جا رہا ہوں باجی''

اور میں خاموشی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ راجدہ نے نند کو آتے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا اور کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئی تھی۔

حضوری باغ کی اس حبس آلود ویران رات کے سائے میں بیٹھا راجدہ کو یاد کر رہا تھا' سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور مچھر مار رہا تھا۔ اسی طرح سوتے جاگتے راجدہ کو یاد کرتے اور مچھر مارتے رات کٹ گئی۔ آسمان پر صبح کی نیلی نیلی روشنی نمودار ہوئی۔ آرٹسٹ بھائی بھی اٹھ بیٹھا۔ ہم نے ایک نل پر جا کر منہ دھویا اور سبز چائے کے ساتھ کلچے کا ناشتہ کرنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس روز دوپہر کے بعد میں راجدہ کے گھر گیا۔ مجھے اس کا بڑا بھائی اور والدہ دوسری منزل کے دالان میں تخت پوش پر بیٹھے ملے۔ میں سلام کر کے ان کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن میری آنکھیں جس روئے زیبا کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خدا جانے راجدہ اوپر والی منزل میں تھی یا کہاں تھی۔ میری باتوں میں گرم جوشی بالکل نہیں تھی۔ میں بڑی بے دلی سے ہر بات کا جواب دے رہا تھا۔

راجدہ کا بھائی اٹھ کر گلی میں نکل گیا' اب میں نے پھوپھی سے پوچھا۔

''باجی سعیدہ کہاں ہے؟''

سعیدہ' راجدہ کی نند کا نام تھا۔ میں نے سوچا اس کا پوچھوں گا تو راجدہ کا بھی پتہ چل جائے گا۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں انار کلی کپڑا خریدنے گئی ہوئی ہیں۔ میں اداس ہو گیا' جانے انار کلی سے وہ کب لوٹیں۔ جانے ابھی ہجر و فراق کی کتنی صدیاں گزارنی پڑیں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ راجدہ آ رہی تھی' میری آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ دوسرے لمحے دروازے پر پہلے سعیدہ باجی اور پھر راجدہ نمودار ہوئی۔ اس نے سیاہ برقعے کا نقاب الٹ رکھا تھا' ناک میں سرخ نگینہ اور اوپر والے ہونٹ پر پسینے کے سفید موتی چمک رہے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا' اس کی پر اسرار خاموش آنکھوں میں خوشی کی چمک نمودار ہوئی' ہونٹوں کے کناروں پر مسرت کی ایک ہلکی سی لہر آئی اور وہ میرے قریب سے گزر کر تخت پوش پر اپنی امی کے پاس بیٹھ گئی اور لفافے میں سے ریشمی کپڑے کے ٹکڑے نکال کر دکھانے لگی'

راجدہ جب میرے قریب سے گزری تو مجھے حنا کے عطر کی خوشبو آئی تھی' ساس بہو کپڑے کی کوالٹی اور قیمت پر باتیں کرنے لگیں۔ راجدہ ان میں شریک تھی لیکن وہ ساتھ ساتھ انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔ کیسی عجیب لڑکی تھی' بہت خاموش' بے حد ضرورت کے وقت مختصر ترین بات کرنے والی' علم وادب سے ناآشنا لیکن اپنے عمل سے علم وادب سکھلانے والی' وہ افسانے نہیں پڑھتی تھی مگر اس نے مجھے ''منزل منزل'' ایسا خوبصورت افسانہ دیا۔

ہم نے جس کمرے میں بیٹھ کر چائے پی وہاں ایک وکٹوریہ عہد کا پلنگ بچھا تھا' آرام کرسیوں کے درمیان میں ایک گول تپائی پر چائے کے برتن سجے تھے' راجدہ چائے بنا رہی تھی۔ میں سعیدہ باجی سے باتیں کر رہا تھا اور راجدہ کی انگلیوں کو دیکھ رہا تھا جن کے پور حنا کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ واپس جاتے ہوئے میں نے سیڑھیوں کے اندھیرے میں کھڑے کھڑے جلدی سے راجدہ کی انگلیوں کو چوما تو ان میں سے حنا کی ہلکی ہلکی گرم گرم خوشبو آ رہی تھی۔ راجدہ چائے بہت اچھی بناتی جیسا کہ کشمیری گھروں میں لڑکیاں بنایا کرتی تھیں لیکن راجدہ کے ہاتھ سے بنائی ہوئی چائے میں مجھے سیلون کی موسلا دھار بارش میں بھیگتے جنگلوں کی مہک آیا کرتی۔ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ چائے پر ہم کیا باتیں کرتے رہے' اتنا یاد ہے کہ وہ بڑی معمولی سی باتیں تھیں' عام گھریلو زندگی کی باتیں' رشتہ داروں کی باتیں۔۔۔۔۔۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات اور مہاجرین کی باتیں' لیکن میرا سارا دھیان راجدہ کی طرف تھا۔ باجی سعیدہ باتیں کر رہی تھی اور میں کسی اور ہی سمت دیکھ رہا تھا اور کچھ اور ہی سن رہا تھا۔ میرے ذہن میں سیلون کی چائے کی خوشبو تھی اور جنگلوں کی موسلا دھار بارشوں کی آواز تھی۔

میں نے وسن پورہ ہی میں اپنا پہلا افسانہ ''منزل منزل'' لکھا جو راجدہ کے بارے میں تھا۔ راجدہ نے ایک بار مجھے کہا کہ میرے بارے میں کچھ نہ لکھنا' میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میں نے ''منزل منزل'' لکھا اور راجدہ کو لاہور کی ایک نیم روشن گلی سے نکال کر روشن دھوپ میں لے آیا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ میں لاہور چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے کانوں میں اس کی شادی کے باجوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شادی کے بعد ایک روز اس سے ملاقات ہو گئی۔ زرد سونا' سنہری گوٹے والا دوپٹہ' پراسرار خاموش آنکھیں' وہ مجھے خوشی سے تک رہی تھی۔ خدا جانے یہ کیا معمہ تھا کہ وہ مجھے خاموشی سے تک رہی تھی۔ خدا جانے یہ کیا معمہ تھا کہ وہ ہمیشہ مجھے خاموش آنکھوں سے تکتی رہا کرتی۔ بہت ہی کم بات کرتی' کسی وقت پلکیں جھپکا کر نظریں نیچی کرتی اور پھر تکنا شروع کر دیتی۔ کسی عجیب وغریب دنیا کی لڑکی تھی۔ سیدھی مانگ' سیدھے لمبے بال' گہری سیاہ آنکھیں۔

میں نے اپنا پہلا افسانہ راجدہ کے نکاح کے بعد وسن پورے میں پنسل سے لکھا۔ اس کا نام میں نے ''پردیسی'' رکھا۔ ان دنوں

پردیسی اور ساجن قسم کے لفظوں کا بڑا رواج تھا۔ افسانہ کافی طویل تھا۔ میں نے اپنی بڑی ہمشیرہ کو سنایا تو وہ رونے لگیں۔ میں نے افسانہ الماری میں رکھا اور لارنس باغ میں آ کر روشوں میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ راجدہ کے زخم نے میرے دل کو ساری دنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ''ادب لطیف'' کا سالنامہ شائع ہونے والا تھا۔ عارف عبدالمتین نے مجھ سے افسانے کے لیے کہا' میں نے اسے ''منزل منزل'' نام رکھ کر اپنا افسانہ ''پردیسی'' دے دیا۔ بہرحال وہ چھپ گیا۔

آج بھی اس وقت بھی جبکہ میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں مجھے راجدہ کی محبت اور محبت کے ان حسین ترین دنوں کے مقابلے میں اپنے سارے افسانے' سارے ناول' ساری کتابیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ کتابیں بے جان ہیں' خوشبو نہیں دیتیں' لیکن وہ پرانی محبت' وہ محبت میں گزارے ہوئے خوبصورت دن' آج بھی گلاب کے تر وتازہ پھولوں کی طرح شگفتہ ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کتابوں میں نہیں بلکہ اپنی محبتوں کی یاد میں زندہ ہوں۔

◆◆◆

ایراوتی کے آنسو

گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں میرا ایک ہم جماعت یاسین ہوا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی کلاس میں ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ ہماری آپس میں دوستی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے ایک بند لفافہ لا کر دیا اور بولا۔

"یہ تمہارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔"

میں نے اسے کھولا تو اس میں کسی اردو رسالے کے صفحے کاٹ کر تہہ کیے ہوئے تھے۔ یہ میرزا ادیب کے "صحرا نورد کے خطوط" کے سلسلے کا ایک خط تھا۔ اس کا عنوان "ہاروت ماروت" تھا۔ میں نے کمپنی باغ میں ایک بنچ پر اسے بیٹھ کر پڑھا اور میرا کمپنی باغ سے واپس گھر جانے کو جی نہ چاہا۔ مجھے اس کہانی نے بے حد متاثر کیا۔ "کنویں سے آج بھی سمیرا کی آواز کبھی کبھی سنائی دیتی ہے' جو ہاروت کو پکار رہی ہوتی ہے۔" کچھ اس قسم کا اس کہانی کا آخری جملہ تھا۔ یہ جملہ میرا تعاقب کرنے لگا۔ سمیرا کی ایک پوری مشکل بن کر میرے سامنے آ گئی اور وہ میرے ساتھ ساتھ رہنے لگی۔ لمبے سیاہ بال' اداس آنکھیں اور زرد چہرہ۔۔۔۔۔۔ سمیرا کلاس روم میں بھی میرے ساتھ ہوتی۔ میرزا ادیب کا افسانہ میں کتابوں کے بستے میں رکھتا اور ڈیسک پر بیٹھے بیٹھے ایک آدھ بار اسے کہیں نہ کہیں سے ضرور پڑھ لیتا۔ ایک روز حساب کے ماسٹر صاحب نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ سوال حل کر رہے تھے اور میں کتابوں کے اندر صحرا نورد کا خط کھولے پڑھ رہا تھا۔ ماسٹر صاحب دبے پاؤں پیچھے سے آئے اور میرے سر پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ صحرا نورد اپنا خط چھوڑ کر بھاگ گیا اور میری آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ حساب کے ماسٹر صاحب دو وجہ سے مجھے بہت مارتے تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں حساب میں نکما تھا اور میں نے حساب کا ہر امتحان نقل مار کر پاس کیا تھا۔

"کمینے! یہ کیا پڑھ رہے ہو؟"

انہوں نے رسالے کے ورق ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھے اور چھڑی سے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ میں بڑے سکون سے مار کھاتا رہا۔ تقریباً ہر پیریڈ میں مجھے بید پڑتے تھے۔ چنانچہ میرے ہاتھ کی کھال سخت ہو گئی تھی اور مجھے یوں لگتا جیسے میں چمڑے کے دستانے پہن کر بید کھا رہا ہوں۔ مار پیٹ سے فارغ ہو کر ماسٹر صاحب نے میرزا ادیب کا افسانہ پھاڑ کر باہر گلی میں پھینک دیا۔ مجھے اس کا بے حد دکھ ہوا مگر میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔

دسویں جماعت میں نے بڑی مشکل سے تھرڈ ڈویژن میں پاس کر لی۔ بھائی جان رنگون جانے لگے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ رنگون میں "شیر" اخبار کے ایڈیٹر تھے اور شام کو ریڈیو رنگون کی اردو سروس میں ایک گھنٹے کا پروگرام بھی کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی جاپان نے اعلان جنگ نہیں کیا تھا۔ رنگون میں برمی' تامل' تلیگو' ملیالم' انگریزی وغیرہ عام بولی جاتی تھی' اردو کو ہندوستانی کہتے تھے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ رنگون سیکرٹریٹ کے گیٹ پر ایک تختی لگی ہوئی تھی' جس پر ہندوستانی اردو میں لکھا تھا۔

"ادھر والے باجو میں موٹر گاڑی کا کھڑی کرنا نہیں ہے۔"

ایسے شہر میں جب مجھے اپنے رنگون کے دوست ارجن دیورشک کی زبانی معلوم ہوا کہ وہاں ایک مکتبہ بھی ہے جو اردو نظم و نثر کی کتابیں چھاپتا اور فروخت کرتا ہے تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس مکتبہ کا میں نام بھول گیا ہوں۔ احمر رنگونی کی نظموں کا مجموعہ "بادۂ احمر" اسی مکتبہ نے چھاپی تھی۔

احمر رنگونی برمی مسلمان شاعر تھا اور علامہ اقبال کی پیروی میں اسلام کے بارے میں پر جوش نظمیں کہا کرتا تھا۔ انہی دنوں میرزا ادیب کی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" شائع ہو کر رنگون آئی' میں مکتبہ کی کتابوں کی فہرست دیکھ رہا تھا کہ میری نظر "صحرا نورد کے خطوط" پر پڑی۔ میں بے حد خوش ہوا۔

بھائی جان سے پیسے لیے اور اسی وقت کتاب خریدنے نکل پڑا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس روز رنگون کا آسمان سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تیز بارش نے میری راہ میں حائل ہونے کی بجائے میرے شوق کو اور بھڑکا دیا۔ رنگون میں لکڑی کی بند صندوق نما بگھیاں چلا کرتی تھیں' میں لپک کر ایک بگھی میں بیٹھ گیا اور بگھی والے کو ایراوتی ایونیو چلنے کو کہا۔ بگھی کی چھت پر بارش نے شور مچا رکھا تھا۔ بارش کے اس حسین شور میں مجھے سمیرا کی آواز سنائی دی۔ ہاروت! ماروت! گھوڑے بارش میں بھیگتے سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ ایراوتی ایونیو میں' مکتبہ کے پاس بگھی رک گئی۔ میں نے وہیں کتاب منگوائی' قیمت ادا کی اور واپس گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ کتاب عام کتابوں سے بڑی تھی اور بہت عمدگی اور خوبصورتی سے چھاپی گئی تھی۔

میری خوشی کا یہ عالم تھا' جیسے مجھے کوئی خفیہ خزانہ مل گیا ہو۔ شام تک میں نے صحرا نورد کے سارے خطوط پڑھ لیے۔ اب میں صحرا نورد بن گیا تھا اور چاہتا تھا کہ اسی انداز میں کسی کو خط لکھوں۔ میرا رنگون کا دوست ارجن دیورشک مجھ سے آٹھ دس برس بڑا تھا۔ میں نے صحرا نورد بن کر اس کے نام ایک خط لکھا۔ اسے دکھایا تو وہ کاپی پر الٹا ہاتھ مار کر بولا۔

''یارا تم نے میرزا ادیب کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔''

اس کے بعد مجھے خط لکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ میں نے ایک روز اپنا لکھا ہوا خط پھاڑا اور دریائے ایراوتی کی لہروں میں پھینک دیا۔ رنگون کے دریا ایراوتی کے پاس میری دو امانتیں محفوظ ہیں۔ ایک امانت میری ڈائری اور دوسری امانت میرا اپھٹا ہوا خط ہے۔ ڈائری میں اس لڑکی کی یاد میں لکھا کرتا تھا جو امرتسر میں رہتی تھی اور جس سے مجھے بے حد محبت تھی۔ رنگون میں مجھے اس کی شادی کی خبر ملی تو میں ارجن دیو رشک کو ساتھ لے کر دریا کی سیر کو چل دیا۔ سمپان یعنی کشتی جب بیچ دریا میں پہنچی تو میں نے جیب سے ڈائری نکال کر دریا کی لہروں کے حوالے کر دی۔ رشک نے حیرانی سے پوچھا۔

''ارے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کیا؟''

میری آنکھوں میں آنسو تھے' چہرہ زرد اور اداس تھا۔ میں پورا دیوداس بنا ہوا تھا' میں نے دیوداس کی آواز میں کہا۔

''وہ چلی گئی دوست' مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔''

دوسری بار جب میں نے اپنا لکھا ہوا ''صحرانورد کا خط'' ایراوتی کی لہروں کے حوالے کیا تو اس وقت بھی میں بہت اداس تھا۔ مجھے یقین ہے میری دوست ایراوتی نے میری دونوں امانتیں اپنے سینے میں محفوظ رکھی ہوں گی۔ انشاء اللہ مرنے کے بعد یہ دونوں چیزیں اس سے لینے کے لیے واپس ضرور جاؤں گی۔

جاپان نے اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو رنگون میں بلیک آؤٹ شروع ہو گئے۔ ریڈیو پر بھائی جان کی مصروفیت بڑھ گئی۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ریڈیو سٹیشن لے جاتے۔ ہفتے میں تین بار میں پنجابی میں خبریں پڑھتا۔ ریڈیو سٹیشن میں ایک برمی لڑکی کام کرتی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلاتے دیکھا تو مجھے صحرانورد کے خطوط کی میرا یاد آ گئی۔

سیاہ بال' سیاہ آنکھیں' زرد اداس چہرہ' میں نے بڑی خاموشی سے اس سے محبت کرنی شروع کر دی۔ ان دنوں خاموش محبت کا بڑا رواج تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوا کرتیں۔ مکالمے اشد ضرورت کے وقت کم سے کم بولے جاتے۔ بھائی جان کے پاس بیٹھے' میں چوری چوری اس برمی لڑکی کو دیکھا کرتا۔ سفید کرنڈی کا کرتہ' نیلے رنگ کا لہنگا' نازک پاؤں میں سفید چپل' جوڑے میں ترناری کے سفید پھول' گلے میں سنہری زنجیر کے ساتھ نیلم چمک رہا ہوتا۔ وہ بڑی شفاف لڑکی تھی۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں اس کے آر پار بھی دیکھ رہا ہوں۔ ٹائپ رائٹر کے پیچھے بیٹھی وہ کسی قدیم بدھ مندر کی دیوداسی معلوم ہوتی۔ ایک بار میں اس کے بالکل قریب سے ہو کر گزرا' مجھے ایسی خوشبو آئی جو میں رنگون کے سولی پیگوڈا میں گوتم بدھ کے مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر محسوس کی تھی۔ میں ہر روز ایراوتی کے

کنارے بیٹھ کر صحرانورد کے خطوط پڑھتا اور ریڈیو سٹیشن آ کے میرا کے درشن کرتا۔

لیکن جاپانیوں کو میرا یہ معمول پسند نہ آیا' انہوں نے دھڑا دھڑ رنگون پر بمباری شروع کر دی۔ وہ پیش قدمی کرتے برما کے گنجان جنگلوں میں پہنچ گئے۔ رنگون میں ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ برمی گورنمنٹ بوریا بستر اٹھا کر شملہ آ گئی۔ مجھے جس بحری جہاز کے ڈیک پر جگہ ملی' وہ جنگ کے دوران رنگون کی بندرگاہ سے روانہ ہونے والا آخری جہاز تھا۔ دشمن کی آبدوزوں اور بمباری سے بچنے کے لیے یہ جہاز کسی لمبے راستے سے کلکتہ کی طرف رواں تھا۔ رات کو جہاز میں بلیک آؤٹ ہوتا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے یہ حقیقت ہے کہ میرے ساتھ سوائے دو کتابوں کے اور کچھ نہ تھا۔

پہلی کتاب جوش ملیح آبادی کا مجموعہ کلام اور دوسری ''صحرانورد کے خطوط''۔۔۔۔۔۔۔ اس بات کو ایک مدت ہو گزری ہے۔ سمندر پار دریا کنارے آباد شہروں کے لوگ بہت دور چلے گئے ہیں۔ لیکن ایراوتی کی لہروں کی سرگوشیاں اور شفاف برمی لڑکی کے ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک مجھے آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ایراوتی کی لہروں کے پاس میرا اپھٹا ہوا صحرانورد کا خط ہے اور برمی لڑکی میرا بن کر میری یادوں کے گلاب میں محو خواب ہے۔ برما کے ایک ماہی گیر سے ایک گیت سنا تھا۔ وہ یاد آ رہا ہے۔

''ایراوتی!

او ایراوتی!

تیرے پانیوں میں ہمارے آنسو ہیں!

تو اداس کیوں ہے۔۔۔۔۔۔؟''

◆◆◆

کنول مرجھا گئے

وہ چائے کی پیالی کہاں ہے جس پر نیلے پھول کھلے تھے؟

چائے اور نیلے پھول۔۔۔۔۔۔خزاں کی ویراں سرد راتوں میں کھلنے والے نیلے پھول۔۔۔۔۔۔جو اپنی خوشبو کا گھونگھٹ کاڑھے چاندنی رات کی سیج پر پچھلے پہر کی سرگوشیاں سنتے ہیں۔ آج مجھے کچھ ایسی یادیں آ رہی ہیں جن کی کوئی شکل نہیں' کوئی آواز نہیں' صرف کچھ رنگ ہیں' کچھ خوشبوئیں ہیں۔ کبھی بارش کی آواز سنتا ہوں۔ جنگل کی بارش' دریا کی بارش' کبھی سورج کو سمندر میں غروب ہوتے دیکھتا ہوں۔ روشنی ایک شاہراہ ہے جو میرے اور سورج کے درمیان پھیل گئی ہے۔ سڑک پر ناہلیوں کے سیاہ پتوں کو ہوا کے تعاقب میں دیکھتا ہوں۔ سرد رات کو پرانے مکانوں میں گرم لحاف میں دبکے ہوئے دیکھتا ہوں اور ان پرانے مکانوں' ویران گلیوں اور شہروں سے دور کچھ باغ ہیں۔

بے برگ و بار' اجڑے ہوئے باغ اور پھر دھواں دھار بارش میں نہاتے ہوئے' مسکراتے ہوئے سفید بے داغ کنول اور تیز ہواؤں میں جھک کر ٹہنیوں کا پنکھا کرتے' ناریل کے درخت' ساحل سمندر میں اپنا عکس دیکھتے تاڑ کے شجر......

گھنے سنسان جنگل میں خوشبو اڑاتی چاندنی اور ایراوتی کے ملاحوں کے گیت اور فٹ پاتھ پر سے گزرتی سیلونی لڑکیوں کے گھنے سیاہ بالوں کے سفید پھول۔

ایسا ہی ایک پھول میں نے دریائے ایراوتی کی لہروں میں بہتا دیکھا تھا۔ مجھے لاہور یاد آ گیا۔ دریائے راوی یاد آ گیا۔ رنگون میں بیٹھا میں راوی کو یاد کر رہا تھا۔

وگدی اے راوی ماہی وے۔۔۔۔۔۔۔وچ اک پھول تر دا ڈھولا
اک پھل منگیا ماہی وے۔۔۔۔۔۔۔سارا باغ حوالے ڈھولا

وہ کس قدر خوش قسمت پھول تھا جسے کسی نے مانگا اور سارا باغ عطا کر دیا گیا۔ ایراوتی ایک دریا ہے' برما کا سب سے عظیم' سب سے خوبصورت دریا۔۔۔۔۔۔راوی بھی ایک دریا ہے' پنجاب کا سب سے رومانٹک' سب سے عظیم اور پراسرار دریا۔۔۔۔۔۔جو کبھی شاہی قلعے کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا' اب شاہدرہ کے اس پار ساری آبادیوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ میں نے آج سے پندرہ

برس پہلے سیلاب میں راوی بپھرتے دیکھا ہے اور انہی لہروں پر کسانوں کے مکانوں کی چھتوں اور ڈھور ڈنگر کو بہتے دیکھا ہے۔ اس راوی کی لہروں پر میں نے ایک پھول کو بھی دیکھا تھا۔ چنانچہ اسی قسم کا پھول جب میں نے دریائے ایراوتی کی لہروں پر تیرتے دیکھا تو مجھے لاہور یاد آ گیا۔ دریائے راوی یاد آ گیا۔

مجھے یاد ہے میں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دریائے راوی کی بستیوں کو اپنی طرف بلایا تھا۔ لاہور کو یاد کیا تھا اور آسمان پر کھلے ہوئے ستاروں کے پھول کو اپنا گواہ بنایا تھا۔

ناریل کا سفید پھول' ناریل کے سخت چھلکے کے اندر جنم لیتا ہے اور میٹھے پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ تاڑ اور چھالیہ کا درخت' جنوب مشرقی ایشیا کی ہواؤں میں جھومتا ہے۔ کنول کا پھول تالاب کی دلدل میں طلوع ہوتا ہے۔ سفید سورج بن کر طلوع ہوتا ہے۔ کنول کے پھول جنوب مشرقی ایشیا میں ہوتے ہیں لیکن یہ پھول پنجاب میں بھی ہوتے ہیں۔ لاہور سے پنڈی جاتے ہوئے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ تالابوں میں کھلے ہوتے ہیں۔ سردیوں میں کھلے ہوتے ہیں' چھ سات روز کھلتے ہیں۔

ہمارے شہر میں دیہاتی عورتیں کنول کے پھول بیچنے آیا کرتی تھیں۔ میں بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے یاد ہے وہ آواز لگایا کرتیں۔

''کمیاں لے لو کمیاں''

لمبے ڈنٹھلوں والے سفید پورے کھلے ہوئے کنول کے پھول' انہوں نے کاندھوں پر ڈال رکھے تھے۔ عورتیں ان پھولوں کو خرید کر شاید پکاتیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں' اتنا یاد ہے کہ حکیم ابراہیم کہا کرتے تھے۔

''اوئے' یہ نیلوفر ہے۔''

یعنی کنول کا پھول نیلوفر تھا اور نیلوفر کا شربت بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ابراہیم عطار بھی ایک دلچسپ شخصیت تھی۔ صبح صبح دوکان کھول کر شربت کی بوتلوں پر پانی چھڑکتا' ادھر ادھر جھاڑ پونچھ کرتا اور بڑے سکون سے دری بچھا کر طب کی کوئی پرانی کتاب کھولتا اور مطالعہ شروع کر دیتا۔ اب اسے بالکل کوئی خبر نہ ہوتی کہ محلے میں کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔وہ مطالعہ میں منہمک ہوتا' پھر ایک بچی اس کے پاس آ کر کہتی۔

''حکیم جی! آنے دا شربت دیئو''

پہلے تو حکیم ابراہیم سنی ان سنی کر دیتا۔ جب لڑکی یعنی گاہک کا اصرار بڑھتا تو وہ طب کی کتاب بند کر کے گاہک کو گھور کر دیکھتا اور اتنا کہہ کر شربت کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا۔

''پڑھنا کیہ اے' ایدھر دو کان کھولو' اودھروں گاہک اوناں شروع ہو جاندے نیں۔''

یہ بڑے حیرت انگیز لوگ تھے جو چلے گئے' ہماری پرانی نسل کے بزرگ' وضع دار' سلیقہ شعار' باادب اور پڑھے لکھے...... اب تو شہر لاہور میں وہ پھول بھی نہیں کھلتے' جو کبھی صبح کو پاکیزہ ہواؤں کے ساتھ آنکھ کھولا کرتے تھے۔ میں نے اس شہر میں لوگوں کو مرتے دیکھا ہے' پھولوں کو کھلتے اور مرجھاتے دیکھا ہے۔ جھلسا دینے والی لو میں فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے فقیروں کو دیکھا ہے اور ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں خراٹے لیتے خرکاروں کو دیکھا ہے۔ پھر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر گرم دوپہروں میں مجھے اس سلونی لڑکی کا خیال آتا ہے جس نے اپنے سیاہ بالوں میں کنول کا سفید پھول سجایا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پرانے معبد کی زنگ آلود دیوار کے ساتھ لگی آدھی رات کی تنہائیوں میں اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہے۔

اتنے خوبصورت رومانٹک خیالوں کے ساتھ میں ریگل کے چوک میں پہنچ جاتا اور پھر اچانک سامنے سے ناصر کاظمی نمودار ہو کر کہتا۔

''اے حمید کدھر دیکھ رہے ہو؟''

ناصر کاظمی نے کبھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کدھر جا رہے ہو۔ وہ ہمیشہ جب کبھی سڑک پر ملتا تو یہی کہتا۔ ''اے حمید کدھر دیکھ رہے ہو؟''

ایک روز وہ مجھے ملا تو کچھ اداس تھا۔ میں نے پوچھا۔

''ناصر! کیا بات ہے؟''

ذرا سا کھانس کر بولا۔ ''یار آج انناس کا ناشتہ نہیں کیا' طبیعت اداس ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ ناصر کاظمی کو سال میں ایک آدھ بار ہی انناس نصیب ہوتا ہے جس طرح مجھے نصیب ہوتا ہے' ڈبے کا انناس۔ پھر بھی مجھے ناصر کاظمی پر بڑا پیار آیا۔ میں نے کہا۔

''اوئے کمینے! تو نے زندہ انناس دیکھا ہے؟''

''یار انبالے میں ایک بار دیکھا تھا۔''

''ڈبے میں اس کی لاش کے ٹکڑے دیکھے ہوں گے۔''

''ہاں------''

اور میں فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے فقیر کے پاس کھڑا انناس اور اس کے جنگلوں کی پراسرار مہک میں کھو گیا اور پھر میں نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ پراسرار سی سیاہ آنکھوں والی لڑکی------جس نے فٹ پاتھ پر بس سٹاپ کے پاس کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں سجا

ہوا پھول نکالا۔ اس نے سونگھا اور میری طرف پھینک دیا۔

وہ پھول ابھی تک فضاؤں میں ہے۔

فٹ پاتھ پر گرد اڑتی ہے' گرم لو کے جھکڑ چلتے ہیں۔

پھول ہوا میں معلق ہے' بس سٹاپ ویران ہے' فقیر بھیک مانگ رہا ہے

اور

میں کنول کے سفید پھول کو دیکھ رہا ہوں۔

◆◆◆

پرانی حویلی کی لڑکی

مجھے وہ شام آج بھی یاد ہے۔

میں اور وہ لڑکی' شہر سے باہر ایک پرانی قلعہ نما چھوٹی سی حویلی کے عقبی باغ میں بانس کی کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شروع سردیوں کی ایک خنک شام تھی۔ گھاس پر درختوں تلے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس پرانی چار دیواری والے باغ میں آم کے جھنڈوں میں ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ ناشپاتی کا ایک پت جھڑ پیڑ اپنی کالی کالی ٹہنیاں اٹھائے ہماری تپائی سے ذرا پرے چپ چاپ کھڑا تھا۔ تپائی پر کشمیری سماوار اور دو پیالیاں ٹرے میں رکھی تھیں۔ آم کا ایک زرد پتا اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر فضا میں چکر کھاتا ہوا تپائی پر سماوار کے پاس آن گرا' یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے آہستہ سے سسکی بھری ہو اس لڑکی نے پیالیوں میں سبز چائے انڈیلتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ذرا سی مسکرائی' اس کی مسکراہٹ میں نومبر کی شام کی اداسی تھی۔ اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔

لیکن چائے پینے سے پہلے میں آپ سے اس لڑکی کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ یہ دبلی پتلی سی لڑکی جس کی آنکھیں سیاہ ہیں اور بالوں کا رنگ براؤن ہے۔ بالوں میں یہ لڑکی ہمیشہ کسی نہ کسی پیڑ کے زرد پتے لگاتی ہے۔ اس کے ہونٹ سرخ آلوچے کی مانند بھرے بھرے ہیں اور دھوپ میں ان پر ایک روغنی چمک سی آ جاتی ہے۔ ان ہونٹوں کا اپنا رنگ بھی آلوچے کی طرح گہرا سرخ' گہرا سانولا ہے۔ یہ رنگ سنگلدیپ کے جنگلوں میں دھواں دھار بارش کے بعد مہاگنی کے اس ٹپکاتے درختوں کا رنگ ہے۔ یہ گرم سمندروں کے کنارے تیز دھوپ میں ریت پر گرے ناریل کا رنگ ہے۔ جس کا اس دھوپ کی تپش میں اندر ہی اندر گرم ہو کر مہک اڑ رہا ہو۔

یہ لڑکی جس کا نام صبا ہے' شہر سے باہر اس پرانی عمارت میں اکیلی رہتی تھی۔ میری اس سے پہلی ملاقات اس اجڑی ہوئی حویلی کے باغ میں ہوئی' یہ باغ ویران ہو چکا تھا۔ اور اس کی چار دیواری جگہ جگہ سے شکستہ ہو رہی تھی۔ کھلے پھاٹک کا دروازہ تھوڑا سا زمین میں دھنس گیا تھا۔ گیٹ کی محراب کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا' حویلی کی چھت پر گھاس اگی ہوئی تھی اور پرانی کھڑکیوں کے چھجے پر گھاس عشق پیچاں کی بیلوں میں چھپ گئے تھے۔ اس حویلی کا علاقہ شہر سے باہر دریا کے کنارے واقع تھا۔ حویلی کا پرانا باغ دریا تک چلا گیا تھا۔ ایک روز منہ اندھیرے میں دریا کے کنارے سیر کر رہا تھا کہ اچانک مجھے فضا میں عطر و لوبان کی تیز خوشبو محسوس ہوئی اور اس

کے ساتھ ہی کسی عورت کے کچھ پڑھنے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دی۔

یہ آواز اور خوشبو پرانی حویلی کی طرف سے آ رہی تھی۔ میرا دل اپنے آپ اس حویلی کی طرف کھنچنے لگا۔ چنبیلی اور انار کی جھاڑیوں کے عقب میں حویلی کی ایک نیچی کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھولا تو میں نے اس لڑکی کو دیکھا جو ایک گہرے رنگ کی قالین پر لمبے بالوں میں گلاب کے پھول سجائے آنکھیں بند کئے بیٹھی کچھ گنگنا رہی تھی۔ اس کے ارد گرد میزوں پر اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ اس کے سامنے چاندی کی طشتریوں میں موتیے کے سفید شگوفے رکھے تھے۔ میں اس کھڑکی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور اس لڑکی کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اس لڑکی نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں عبادت کے تقدس میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے چاندی کی طشتری میں سے کچھ پھول اٹھا کر مجھے دیئے' میں نے ان شگوفوں کو چوم کر جیب میں رکھ لیا میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس پرانی حویلی میں کہاں سے آئی ہے۔

اس نے بتایا۔

''میرا نام صبا ہے' جب میں سری لنکا میں پیدا ہوئی تو میرا نام انا پورنا تھا۔ پھر میں نے بنگال میں جنم لیا تو میرا نام سجاتا تھا۔ اب میں تمہارے ملک میں آئی ہوں اور میرا نام صبا ہے۔ میں رامیشورم کے مندر میں دیوداسی تھی' میں نے شانتی نکیتن میں ستار بجانا سیکھا' کئی سو سال پہلے میں لکشمی کے روپ میں گنگا کی وادی میں سنسار اور بیز' درندیوں کے شمال میں پیدا ہوئی۔ میں نے بھگوان بدھ کو بار ابار کے جنگلوں میں انسان کے دکھوں کے لیے گہری سوچ میں گم دیکھا' میں نے ان کے قدموں میں چاول اور چنبیلی کے پھول پیش کئے اور اپنے بچھڑے ہوئے محبوب سے ملنے کی تمنا کی۔ اس عظیم شہزادے نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا' تمہاری خوشیاں طویل ہوں' میری بہن! جس کو تم نے بھگوان سمجھا ہے وہ تمہارا بھائی ہے جو کبھی شہزادہ تھا' اور آج اپنے دکھی بھائیوں کے لیے خوشی ڈھونڈنے جنگل میں بیٹھا ہے۔ شہزادے کے چہرے پر سکون تھا جیسے سوسن کا پھول سو رہا ہو' میں وہاں سے چلی آئی میں نے ہر جنم میں محبت کے گیت گائے ہیں اور خوشبو اڑاتے درختوں تلے باہیں پھیلا کر چیت کے مہینے کا خیر مقدم کیا ہے' میں ہر دور میں پھولوں کے ساتھ طلوع ہوتی ہوں اور پت جھڑ کے زرد پتوں کو جنگل جنگل اڑائے لیے پھرتی رہی ہوں۔ میں صبا ہوں' سجاتا ہوں' انا پورنا ہوں' میں تازہ کھلے پھول کی مہک ہوں' میں صبح کی پاکیزہ ہوا ہوں' میں رات کی پراسرار خاموشی ہوں۔''

اب میں ہر روز منہ اندھیرے پرانی حویلی میں صبا سے ملنے جاتا۔ ہم دونوں دریا کے کنارے سیر کرتے مرغابیوں کو نیم روشن آسمان پر نیچی اڑان کے بعد لمبی گھاس میں اترتا دیکھتے۔ ہم ایک دوسرے کی محبت سے بے نیاز تھے۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتی تو

اسے سوائے میرے یا درختوں' پرندوں' دریا کی لہروں اور صبح کی ہوا جھومتی گھاس کے اور کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ سورج مکھی کے پھول کی طرح ہمارا چہرہ ایک دوسرے کے مقابل رہتا۔ ہم نے اپنی محبت کو اپنی جھولی میں سمیٹنے کی بجائے اسے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اسے چاروں طرف لٹا دیا تھا۔ ہم اس محبت سے بہت آگے نکل آئے تھے' جس میں شہر ویران ہو جاتے ہیں' ہماری محبت نئی بستیوں میں پھول کھلا رہی تھی۔

آج اس بات کو بہت سال بیت گئے ہیں۔ صبا پھر مجھ سے نہیں ملی' لیکن میں نومبر کی ہر شام کو اس سے ملتا ہوں' جب سورج دریا کے کنارے آم کے جھنڈوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگتا ہے تو پرانے باغ میں زرد پتوں پر ایک تپائی پر رکھا سماوار سبز چائے کی مہک اڑاتا ہے پھر ایک سیاہ آنکھوں والی لڑکی براؤن بالوں میں زرد پتے سجائے چپکے سے تپائی کے قریب آن کھڑی ہوتی ہے' مجھے ایک دھیمی سی سرگوشی کی آواز سنائی دیتی ہے' جیسے کوئی پیالی میں چائے انڈیل رہا ہو اور میں سگریٹ سلگاتے آنکھیں بند کر لیتا ہوں' اندھیرا' سفید ستارے' چپ چاپ' آم کے جھنڈ ریشمی رومال' حنا کی خوشبو' چائے کی سرگوشی اور درخت کی ڈال سے ٹوٹ کر گرتا زرد پتا۔

◆◆◆

ڈھاکہ جل رہا تھا

میرے تین خالہ زاد بھائی فیاض' فاروق اور مشفق کاروبار کے سلسلہ میں ڈھاکہ میں مقیم تھے اور وہاں سے بڑی دہشت ناک اور ہراس انگیز خبریں لاہور پہنچ رہی تھیں۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں ان خبروں کی دہشت اور سراسیمگی میں اضافہ ہو گیا۔ ہم بے حد پریشان تھے۔ سارا مغربی پاکستان پریشان تھا کہ مشرقی پاکستان میں یہ آگ کس نے لگائی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں نے تو اپنی مرضی سے ہندوستان سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اس سے پہلے میں مشرقی پاکستان کے چپے چپے کی سیاحت کر چکا ہوں۔ ڈھاکہ سے چٹاگام اور وہاں سے رانگا متی' کپتائی کے سلسلہ ہائے کوہ تک گھوم پھر چکا ہوں' میں نے ان لوگوں میں اسلام کے رشتے کو بے حد گہرا اور مضبوط پایا ہے۔ مشرقی پاکستان اور خاص طور پر چٹاگام کے مسلمان تو اپنی اسلام دوستی اور شعار اسلام کی پابندی میں بے حد سخت ہیں۔ اس کا ایک معمولی ثبوت وہاں کے مسلمانوں کے خالص عربی تراکیب اور اضافت والے نام ہیں۔ آپ کو ایسے سچے اور خالص اسلامی نام پاکستان میں کسی اور صوبے میں نہیں ملیں گے۔ کلکتہ میں بھی بنگالی اور خاص طور پر چٹاگانگ کے مسلمان اپنی چوخانہ دھوتی اور جھالریں ڈاڑھی کے ساتھ صاف پہچانے جاتے ہیں۔ مجھے اپنے عزیزوں کی بھی فکر تھی۔ اور اس بات پر حیرت تھی کہ مشرقی پاکستان کے سرسبز اور شاداب کھیتوں اور چاندنی میں چمکتے دریاؤں اور محنت کش مانجھیوں کے گیتوں میں نفرت کی آگ کس نے لگا دی؟

بہر حال میں اپنے خالہ زاد بھائی زلف کے ساتھ لاہور سے کراچی اور کراچی سے ڈھاکہ روانہ ہو گیا۔

یہ مارچ کی گیارہ تاریخ تھی۔

۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو رات کو سوا ایک بجے کراچی سے بوئنگ میں بیٹھے اور صبح سوا آٹھ بجے ڈھاکہ پہنچ گئے۔ جہاز کی کھڑکی میں سے ہم نے دیکھا کہ دریاؤں میں کہیں کہیں کشتیاں چل رہی تھیں اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر بھی ایک قسم کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے ۱۹۴۷ء کا فساد زدہ امرتسر یاد آ گیا۔ زلف نے کہا۔

''حمید صاحب! معاملہ کافی گڑ بڑ معلوم ہوتا ہے۔''

لیکن میں پر امید تھا۔ میں بچپن ہی سے بنگال سے بڑا قریب رہا ہوں۔ امرتسری شال بافوں کا دھندا کلکتے میں بہت پھیلا ہوا تھا اور کلکتے کی زکریا سٹریٹ' مسجد ناخدا اور لوئر چیت پور روڈ ان کے گڑھ ہوا کرتے تھے۔ کلکتے کے بنگالی مسلمان بھی ہندو استحصال پسند

بنگالیوں سے شدید نالاں تھے اور انہیں اس حقیقت کا بھرپور احساس تھا کہ ہندو کی برہمنی ذہنیت مسلمان بنگالیوں کو لوٹ کھسوٹ کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ہمیشہ اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ تحریک پاکستان میں صوبہ آسام کے مسلمانوں کے علاوہ مغربی بنگال کے مسلمانوں نے بھی بے پناہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہندوستان کی برہمنی سرکار نے مشرقی پاکستان کو قبول نہیں کیا تھا وہ ہمیشہ سے یہی سازش کرتا چلا آیا ہے کہ جب بھی موقع ملے مشرقی پاکستان کو اپنے ایجنٹوں اور زرخرید شرپسندوں کی مدد سے بھارت میں مدغم کر دیا جائے۔ میں نے زلف سے کہا۔

''فکر نہ کرو میاں' میں مشرقی پاکستان کے دریاؤں' وادیوں پر غیر ملکی سایوں کو چلتا پھرتا دیکھ رہا ہوں۔ سچ کا سورج نکلنے لگا اور جھوٹ کے سائے بھاگ جائیں گے۔''

ڈھاکہ کے ائیر پورٹ پر ایک ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پاک فوج اور پاک ائیر فورس کے چاق و چوبند جوان اہم مقامات پر مستعد کھڑے تھے۔ ہم دوسرے مسافروں کے ساتھ لاؤنج میں آ گئے یہاں ایک دہشت ناک خاموشی طاری تھی۔ سوائے پینے کے پانی کے اور کچھ نہ تھا۔ چیکنگ کے بعد ہم ائیر پورٹ سے باہر آئے تو برآمدوں اور لان میں پناہ گزیں افراد کا ایک ہجوم اپنے سامان کے ساتھ کسمپرسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے خیال میرے ذہن میں یہ آیا تھا کہ شرپسند اور غیر ملکی ایجنٹ مشرقی پاکستان کی فضا کو زہر آلود کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ اس ہجوم میں ایک بنگلہ کنبہ بھی تھا' میں اس کنبے کو دیکھ کر بڑا حیران ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔ جب کنبے کے سربراہ عزیز الرحیم چوہدری سے میں نے ڈھاکہ سے نقل مکانی کی وجہ پوچھی تو وہ آہ بھر کر بولے۔

''میرے گھر کو صرف اس لیے آگ لگا دی گئی کہ میں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے حامیوں کو ووٹ نہیں دیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔

''آپ نے شیخ مجیب کے حامیوں کو ووٹ کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ شیخ مجیب اور اس کے حامی ایک پاکستان کے حق میں نہیں ہیں' وہ ملک کے دشمن ہیں' پاکستان کے دشمن ہیں' ہم نے شیلانگ میں رہ کر پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا اور وہاں سے لٹ پٹ کر ڈھاکہ آئے تھے۔ ہمیں خوشی تھی کہ ہم اپنے وطن پاکستان آ گئے ہیں لیکن اب ہم یہ کیسے گوارہ کر سکتے ہیں کہ جس پاکستان کے لیے ہم نے اپنی جان و مال کی قربانیاں دی ہیں اسے غیر ملکی سازش اور تباہی و بربادی کا نشانہ بنایا جائے۔

عزیز الرحیم سے یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ اس بات چیت میں یہ ثابت ہو گیا کہ ملک دشمن عناصر بھارتی روپیہ اور اسلحہ

کے ساتھ پوری طرح سرگرم پیکار ہیں۔ دھوپ میں بیٹھی ہوئی مہاجر عورتیں اور بچے اور بوڑھے پسینے میں شرابور تھے۔ ایک آدمی گول آئینہ صندوق کے ساتھ لگائے ڈاڑھی مونڈھ رہا تھا اس کی ادھیڑ عمر بیوی دھوئیں سے کالی کیتلی میں چائے بنا رہی تھی۔

میں اور زلف ائیر پورٹ سے باہر آ گئے دن کے دس بج رہے تھے۔ دھوپ بڑی تیز تھی' فضا میں حبس اور گرمی تھی۔ بسوں' گاڑیوں اور رکشاؤں پر سیاہ جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ غریب محنت کش اور سادہ دل عوام تخریب پسند غیر ملکی ایجنٹوں کی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ ہم نے ایک موٹر رکشا لیا اور چھاؤنی میں اپنے ایک عزیز سے ملنے چل پڑے۔ چھاؤنی کی سڑک شروع ہوتے ہی فوج کی چیک پوسٹ تھی۔ ہر شہر میں شیخ مجیب نے متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ صدر پاکستان دوسرے سیاسی لیڈروں کے ساتھ مل کر قوم کی ناؤ کو شدید بحران سے باہر نکالنے کی مخلصانہ اور سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ فوج پورے نظم و ضبط کے ساتھ خاموش تھی۔ اس کی بردباری تحمل اور وطن دوستی اس کے شایان شان تھی۔ چیک پوسٹ پر رکشے کا سیاہ جھنڈا اتار دیا گیا اور ملٹری پولیس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں اور کن صاحب سے ملنے جا رہے ہیں۔ اطمینان ہو جانے پر ہمیں اجازت مل گئی۔ ہم اپنے عزیز کے ہاں پہنچے۔ دوپہر کے کھانے پر ساتھ والی کوٹھی کے دو بنگالی مسلمان بھی مدعو تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر تھا اور دوسرا ڈھاکہ یونیورسٹی کا پروفیسر۔ یہ لوگ بھی وطن پاک کے بحرانی دور سے ہماری ہی طرح فکرمند تھے اور غیر ملکی ایجنٹوں کی تخریبی کارروائیوں پر سخت نفرت اور تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔

بنگالی ڈاکٹر نے کہا۔

''آپ لوگوں کو شاید معلوم نہیں یہاں اکتوبر سے لے کر مارچ کے شروع تک انتہا پسند طلباء اور ملک دشمن عناصر میں بھارتی اسلحہ اور روپیہ تقسیم ہو رہا ہے۔ ہم نے جب پاکستان بنایا تھا تو ہمیں خوشی تھی کہ ہم ہندوؤں کی لوٹ کھسوٹ اور اسلام دشمنی سے محفوظ ہو گئے ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج ہمارے بعض بنگالی مسلمان لیڈر بھارتی ایجنٹوں کے ہاتھ بک گئے ہیں اور اب مشرقی پاکستان کو بیچنے کی فکر میں ہیں۔''

بنگالی ڈاکٹر نے کافی کا گھونٹ پی کر سگریٹ سلگایا اور کہنے لگے۔

''لیکن ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ چند مٹھی بھر لوگوں کا گروہ ہے جو پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔ بنگالی عوام کو اس گروہ نے اپنے دل کش وعدوں سے گمراہ کر رکھا ہے جب مشرقی پاکستان کے عوام پر حقیقت کھل گئی تو یاد رکھیں یہی عوام اپنے وطن دشمن اور غدار لیڈروں سے بڑا عبرت انگیز انتقام لیں گے۔''

دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے عزیز کی گاڑی لی' اس پر سیاہ جھنڈا لہرایا اور اپنے خالہ زاد بھائیوں کی خیریت معلوم کرنے چھاؤنی سے محمد پور کی جانب روانہ ہو گئے۔ محمد پور کی آبادی بالکل ایسے ہے جیسے سمن آباد اور اچھرہ کو ساتھ ملا دیا جائے۔ اس آبادی کے مغربی پہلو میں جو علاقہ سمن آباد طرز کا ہے اسے دھان منڈی کہتے ہیں اور یہیں شیخ مجیب الرحمٰن یعنی کالعدم عوامی لیگ کے صدر کی کوٹھی تھی۔ ہماری گاڑی اپنے بونٹ پر سیاہ جھنڈا لہراتی زیر تعمیر نئے دارالحکومت کی کشادہ سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی فارم گیٹ سے گزر کر محمد پور بستی کے ایوب ایونیو میں داخل ہو گئی۔ ''قصر نو'' بلڈنگ کے زیریں فلیٹ میں خالہ زاد بھائی مقیم تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ فاروق کی بیوی اور مشفق وغیرہ پریشان تھے۔ لیکن فیاض بڑے سکون کے ساتھ کاروبار میں مصروف تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک ادھیڑ عمر امریکی جوڑا بیٹھا تھا جسے فیاض کاشانی اور ایرانی قالین دکھا رہا تھا۔ وہ پورے کاروباری انہماک' توجہ اور پیشانی کے ساتھ امریکی جوڑے کو قالین کے مختلف ٹکڑوں کی خصوصیات بیان کر رہا تھا۔

''یو نو دس کارپٹ از رائیٹ فرام کاشان ۔۔۔۔۔۔۔ اینڈ دس ون فرام اصفہان ۔۔۔۔۔۔۔ یو سی کی پیٹرن' دی کلر کمبی نیشن اینڈ ۔۔۔۔۔۔۔''

باہر پوری آبادی پر ایک خوف اور بے یقینی کی حالت طاری تھی۔ بازاروں میں غیر بنگالیوں کی دوکانیں کھلی تھیں لیکن دوکاندار چپ چپ بیٹھے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ذرا سے کھٹکے پر ایک منٹ کے اندر اندر دوکان بند کر کے روپوش ہو جائیں گے۔ بازار میں دو چار آدمی زور زور سے بولتے تو فوراً مکانوں کی کھڑکیاں بند ہو جاتیں۔ سامنے ایک خالی پلاٹ میں اینٹیں جوڑ کر شہید مینار بنا دیا گیا تھا۔ ایک شام وہاں جلسہ شروع ہو گیا۔ علاقے میں زبردست کشیدگی پھیل گئی۔

اسی رات کوئی ساڑھے بارہ بجے ہم تاش کھیل رہے تھے کہ اچانک باہر بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی پستول کے چھ سات فائر ہوئے ہم نے جھٹ بتی بجھا دی اور ادھ کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگے۔ دھندلی ویران چاندنی میں سڑک سنسان تھی۔ دو آدمی پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے سڑک پر سے گزرے' اس کے ساتھ ہی پستول کا ایک فائر ہوا۔

''کھڑکی بند کر دو' کھڑکی بند کر دو۔'' فیاض چلایا۔

اور کھڑکی بند کر دی گئی۔

◆◆◆

پاکستان کے شہیدوں کو سلام

کوہ مری' ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

مشرقی افق پر طلوع ہونے والی صبح کی نیلی جھلکیاں نمودار ہونے لگی ہیں' آسمان پر بادل بکھرے ہوئے ستاروں کا رنگ دودھیا ہو رہا ہے۔ سنی بنک ڈاک خانے والی مسجد میں ابھی ابھی اذان ہوئی ہے۔ میں بستر چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گیا ہوں پچھلے پہر کے گہرے نیلے آسمان پر ایک بڑا سا چمکیلا ستارہ بھڑک رہا ہے' ہوا سرد ہے۔ کوہ مری میں ستمبر کا مہینہ سردی کا مہینہ ہوتا ہے۔ یہ برف باری کے آغاز کا مہینہ ہوتا ہے۔ سرد ہوائیں چلتی ہیں' بجری گرتی ہے' بارشیں ہوتی ہیں' درختوں پر سے زرد پتے گرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ میں اپنے فلیٹ سے نکل کر سیب کے سرکاری ذخیرے میں آ گیا ہوں' سیب کے ایک درخت کے پاس کھڑا ہوں اور مجھے گالزوردی کی ہیروئن کا خیال آ رہا ہے' جس نے ایک اجنبی پردیسی سے محبت کی اور اس کی یاد میں چشمے میں ڈوب کر ہلاک ہو گئی۔ اجنبی بے وفا تھا۔

آسمان پر سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا ہے۔

اس وقت لاہور چھاؤنی کے ایک بنگلے میں پاک فوج کا ایک مجاہد نماز سے فارغ ہو کر قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا ہے۔ اتنے میں ایک جیپ باہر آ کر رکتی ہے۔ ایک فوجی جوان پاک فوج کے مجاہد کو ایک چٹھی دیتا ہے اور دستخط لے کر سلیوٹ کر کے فوراً واپس پلٹ جاتا ہے۔ مجاہد چٹھی پڑھتا ہے اس کے چہرے پر گہرا سکون ہے۔ قریب ہی اس کی بیوی اپنے سب سے چھوٹے بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ وہ پوچھتی ہے۔

''چٹھی میں کیا لکھا ہے؟''

''بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔''

مجاہد جلدی جلدی وردی پہن کر تیار ہوتا ہے۔ جاتے ہوئے اپنے لڑکے کو پیار کرتا ہے۔ باہر جیپ تیار کھڑی ہے' وہ جیپ میں سوار ہوتا ہے اور محاذ جنگ کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی اپنے گھر' اپنے بال بچوں میں واپس نہ آیا' اس نے دن اور راتیں ہڈیارہ کے ایک چوبارے اور بی آر بی نہر کے کنارے اوپی کرتے' دشمن کے گولا بارود کو تباہ کرتے اور سرزمین پاک کی عزت و

ناموس کے تحفظ کی خاطر گزار دیں۔ وہ صرف آخری دن نہر میں نہایا۔ وہ ریسٹ کے لیے پیچھے آ سکتا تھا' لیکن اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا' صرف اس لیے کہ وہ دشمن کی چالوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اسے ہر طریقے سے تباہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ راتوں کو بالکل نہ سوتا تھا صرف اس لیے کہ پاکستان کے عوام میٹھی نیند سو سکیں۔ پلک جھپکنے کو آنکھ لگتی تو فوراً اٹھ کر دوربین لگاتا اور دشمنوں کے مورچوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا اور پھر نشانوں پر گولا باری کرواتا۔

وہ بی آر بی نہر کے اونچے کنارے پر کھڑا ہو کر دوربین آنکھوں سے لگائے دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک گولا آ کر اسے لگا اور وہ شہید ہو گیا۔ وہ نہر کنارے لیٹ کر بھی او پی کرتا رہتا تھا لیکن وہ صرف فرض ادا ہی نہیں کر رہا بلکہ سرزمین کی طرف اٹھے ہوئے قدم ناپاک کو کچل دینا چاہتا تھا۔

وہ شہید ہو گیا۔ پاک فوج کے دوسرے شہیدوں کی طرح وہ بھی ناموس وطن قربان ہو گیا۔

اس کا نام میجر عزیز بھٹی تھا۔

وہ آخری بار ۶ ستمبر کو اپنے بچے کو پیار کر کے گھر سے نکلا اور پھر کبھی واپس اپنے گھر نہ آیا۔ آج ہم اس شہید اور اس جیسے دوسرے شہیدوں کے خون کا صدقہ اپنے اپنے گھروں میں اپنے اپنے بچوں میں آرام سے بیٹھے ہیں اور ان کی معصوم قلقاریاں سن رہے ہیں۔

کوہ مری میں دن چڑھے یہ خبر پہنچی کہ پاکستان پر بھارت نے حملہ کر دیا ہے۔ لوگ لاہور کی طرف اٹھ دوڑے۔ لاہور کے محاذ پر گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی اور لوگ لاہور جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ہماری قوم نے اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بسوں اور ٹیکسیوں کا کرایہ چڑھا دیا۔ جو ٹیکسی بیس روپے میں پنڈی جاتی تھی' ۸۰' ۸۰ روپے مانگنے لگی۔ میں بھی ایک ٹیکسی میں سوار ہوا اور پنڈی پہنچ گیا۔ پنڈی میں لوگ پر جوش انداز میں بھارت کے حملے میں باتیں کر رہے تھے۔ بچہ بچہ کٹ مرنے کو تیار تھا۔ بسوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بڑی مشکل سے شام کے وقت ایک بس میں جگہ ملی۔

گوجر خاں کے قریب پہنچ کر پولیس نے بس کو آگے جانے سے روک دیا۔ جی ٹی روڈ پر کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ بس نے سواریوں کو گوجر خاں اتار دیا۔ میں بھی وہیں اتر گیا۔ رات ہو گئی تھی۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا تھا۔ مجھے میرا ایک پرانا دوست مل گیا۔ ہم دونوں ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے۔ رات کے دو بجے پنڈی کی طرف سے ایک ٹرین آئی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ راستے میں کئی بار فوجی گاڑیوں کو راستہ دینا پڑا۔

اگلے دن شام کو چھ بجے ہم لاہور پہنچے۔

لاہور کا مورال بہت بلند تھا۔

میں نے رنگون کو جنگ کی حالت میں دیکھا ہے۔

جب پہلی بار بمباری میں رنگون کے لوگ شہر چھوڑ کر جنگلوں کی سمت نکل گئے تھے' لیکن لاہور سے پندرہ بیس میل دور جنگ ہو رہی تھی اور لاہور میں ہر طرف سکون تھا لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ جوم در جوم سرحد کی طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی اپنے مجاہد غازیوں کے شانہ بشانہ دشمن کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔

''جاگ اٹھا ہے سارا وطن''

''جنگ کھیڈ نہیں ہوندی زنانیاں دی''

اور

''ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدے''

ایک حیرت انگیز جوش و خروش تھا جس نے ہر کارکن کی گردن اونچی کر دی تھی۔ ہر شخص قوم کے ایک ذمہ دار فرد کی طرح اپنے کام میں مگن تھا۔

اور اسی اتفاق' تنظیم' اتحاد اور یکجہتی نے ہمیں ایک عظیم الشان فتح سے ہمکنار کیا۔

اور جو ہم نے اللہ کو رسی کو چھوڑ دیا تو رسوا ہو گئے۔

عزیز بھٹی کے مزار سے آج بھی یہی صدا آتی ہے کہ

پاکستان ایک عظیم مقصد کے لیے بنایا گیا ہے' ہمارے پاک شہیدوں کی قربانیاں ہرگز ہرگز ضائع نہیں کی جائیں گی۔ وہ ماؤں کے جگر کے ٹکڑے تھے۔۔۔۔۔۔ شہید نہیں ہوئے تھے تاریخ کے اوراق میں پاکستان کا درخشاں عہد رقم ہو چکا ہے۔ ان شہیدوں کی پاک روح کو اس حقیقت کا علم ہے۔

◆◆◆